www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

July 2011 • No. 416

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 2435 6666, 2435 5454
46521511, Fax: 45651771
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy ₹10
One year ₹100
Two years ₹200
Three years ₹300

Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

جولائی 2011

فہرست

فہمِ دین میں تقویٰ کی اہمیت 2
اصلاحی عمل کا نقطۂ آغاز 3
تائیدِ دین: تین دور 4
مصادرِ شریعت 5
قرآن کی سائنسی تفسیر 6
متبادل نظام 7
نفاق کی علامت 8
عروج و زوال کا قانون 10
تاریخ کے فیصلے کو بدلنا 12
تمثیلی اسلوب 14
تنقید کی دو قسمیں 15
دعوت اور حکمت 16
ایک غیر سائنسی بیان 17
اسلامی رومانیت 18
اتحادِ ملت 19
عظمتِ خویش کانفرنس 20
نظرِ ثانی کی ضرورت 21
خدا کی طرف 22
حسنِ جواب 28
ذہنی تناؤ کا مسئلہ 29
اپنے آپ کو بچائیے 30
اکالُ الرجال 31
ایک خط 32
سوال و جواب 33
خبرنامہ اسلامی مرکز 40

فہمِ دین میں تقویٰ کی اہمیت

قرآن کی سورہ الانفال میں ارشاد ہوا ہے: یٰـأیھـا الـذیـن آمـنوا إن تتّقوا اللـه یـجعل لکم فـرقاناً (8: 29) یعنی اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم اللہ سے ڈرو تو اللہ تمھارے لیے ایک فرقان بہم پہنچا دے گا۔

اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کا صحیح فہم کسی آدمی کو اُس وقت ملتا ہے، جب کہ اس کو اللہ کی معرفت اتنی گہرائی کے ساتھ حاصل ہو کہ وہ اللہ سے ڈرنے لگے، وہ اللہ کے معاملے میں بہت زیادہ محتاط (mindful) بن جائے۔ جب آپ کسی معاملے کی علمی تشریح کریں تو اُس میں ڈر شامل نہیں ہوتا۔ آپ کی نفسیات یہ نہیں ہوتی کہ اگر میں نے غلط تشریح کر دی تو میں سخت طور پر خدا کی پکڑ میں آجاؤں گا۔ لیکن جب آپ کے اندر متقیانہ ذہن پیدا ہو جائے تو آپ کا احساس یہ ہوتا ہے کہ میں اِس کا تحمل نہیں کر سکتا کہ میں کسی دینی امر کا مفہوم اِس طرح بیان کروں جو ادنیٰ درجے میں بھی حق سے ہٹا ہوا ہو:

I can not afford slightest deviation from the right meaning.

مذکورہ آیت میں فرقان کا لفظ آیا ہے۔ فرقان کے لفظ میں فرق کا مفہوم مبالغے کے ساتھ شامل ہے۔ اِس کا مطلب ہے دو چیزوں کے درمیان فرق (differentiate) کرنے کی گہری صلاحیت (الـفـصـل بیـن الشیئین)۔ اِس صلاحیت کا ایک درجہ یہ ہے کہ آدمی علمی بنیاد پر فرق کرنا جانتا ہو۔ لیکن یہ صرف ایک ابتدائی بنیاد ہے۔ فرق کرنے کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر داخلی بصیرت کے درجے میں فرق کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اِسی کا نام فرقان ہے۔ ایسے آدمی کے لیے دین کی صحیح تشریح کرنے کا معاملہ ذاتی نجات کا معاملہ بن جاتا ہے۔ اس کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ دین کی ایسی تشریح کرے جو آخرکار اللہ کے سامنے رد (reject) ہو جانے والی ہو۔ جو آدمی دین کی تشریح میں محتاط ہو، وہ لازمی طور پر دینی عمل میں بھی آخری حد تک محتاط ہو جائے گا۔

اصلاحی عمل کا نقطۂ آغاز

قدیم زمانے میں جب یہود پر سیاسی زوال آیا تو اُن کے اندر یہ مزاج پیدا ہوا کہ وہ لڑ کر دوبارہ اپنا سیاسی اقتدار قائم کریں۔ اُس وقت، بائبل کے بیان کے مطابق، یہود کے پیغمبر یرمیاہ نے اُن سے کہا— بادشاہ اور اس کی والدہ سے کہو کہ عاجزی کرو اور نیچے بیٹھو، کیوں کہ تمھاری بزرگی کا تاج تمھارے سر پر سے اتار لیا گیا ہے:

Say to the king and to the queen mother, "Humble yourselves; sit down, for your rule shall collapse, the crown of your glory." (Jeremiah 13: 18)

یہاں یہود کی مثال کی صورت میں یہ بتایا گیا ہے کہ قوموں پر عروج کے بعد زوال آتا ہے، سیاسی بالادستی کے بعد انھیں سیاسی زیردستی کا تجربہ پیش آتا ہے۔ یہ معاملہ قانونِ فطرت کے تحت پیش آتا ہے۔ اُس وقت قوم کو چاہیے کہ وہ اِس تبدیلی کو تسلیم کرے۔ کیوں کہ اُس وقت اِس تبدیلی کو تسلیم نہ کرنا اپنے آپ کو مزید تباہی کی طرف لے جانے کے ہم معنیٰ ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ سیاسی اقتدار (political power) کسی گروہ کی قومی اجارہ داری (monopoly) نہیں۔ سیاسی اقتدار کا حصول اس کی ضروری اہلیت کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ قوم کے اندر جب تک صلاحیت پائی جائے، سیاسی اقتدار بھی اُس کو حاصل رہے گا۔ صلاحیت کے فقدان کے بعد سیاسی اقتدار بھی اس سے چھن جائے گا۔ جب ایسا ہو تو قوم کو چاہیے کہ وہ دوبارہ اپنے اندر ضروری صلاحیت پیدا کرے، نہ کہ وہ فریق ثانی کے خلاف بے فائدہ جنگ چھیڑ دے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ **ما بقوم** میں تغیر ہمیشہ **ما بأنفس** میں تغیر کا نتیجہ ہوتا ہے (13:11) **مابقوم** سے مراد اجتماعی حالت ہے، اور **ما بأنفس** سے مراد انفرادی حالت۔ جب بھی کسی قوم کی اجتماعی سطح پر زوال آئے تو اس کو اپنے افراد کی سطح پر اس کا سبب ڈھونڈنا چاہیے۔ کیوں کہ قوم کے افراد کی حالت کو بدلنے کے بعد ہی قوم کی اجتماعی حالت بدل سکتی ہے، اس کے بغیر ہرگز نہیں— عمل کا آغاز افراد کی سطح سے ہوتا ہے، نہ کہ اجتماع کی سطح سے۔ اجتماع کی سطح پر جو آغاز ہوتا ہے، وہ صرف لیڈری ہے، نہ کہ کوئی حقیقی عمل۔

تائیدِ دین: تین دور

ایک مفسر قرآن سے پوچھا گیا کہ قرآن کا خلاصہ کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ — سرگزشتِ انذار۔ یہ بات جزئی طور پر درست ہے، لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ قرآن سرگزشتِ دعوت ہے۔ انسانی تاریخ میں پیغمبروں کے ذریعے دعوتِ دین کا جو کام ہوا، قرآن اس کی براہِ راست یا بالواسطہ سرگزشت کا مجموعہ ہے۔ دعوت کا کام اصلاً خدائی پیغام کی پیغام رسانی کا کام ہے۔ مگر اس کام کی انجام دہی کے لیے خصوصی تائید ضروری ہے۔ اِس تائید کے تین بڑے دور ہیں:

1- تائیدِ دین بذریعہ معجزہ۔ 2- تائیدِ دین بذریعہ سکینہ۔

3- تائیدِ دین بذریعہ مذہبی آزادی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے خدا کے جو پیغمبر آئے، اُن کی تائید اللہ تعالیٰ نے معجزات کے ذریعے کی۔ ہر پیغمبر کو اپنے زمانے کے حالات کے اعتبار سے معجزہ دیا گیا۔ قرآن کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اِس قسم کا حسّی معجزہ نہیں دیا گیا (59 :17)، البتہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو خصوصی تائید کے طور پر وہ چیز دی گئی جس کو قرآن میں سکینہ (26 :9) کہا گیا ہے۔

سکینہ سے مراد سکونِ قلب (tranquility) ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو دعوت کے راستے میں غیر معمولی قسم کے شدائد کا سامنا کرنا پڑا۔ بھوک، بائیکاٹ، جلاوطنی، قتال، وغیرہ۔ یہ شدائد اتنے زیادہ سخت تھے کہ عام انسان اُن کا تحمل نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اور اصحابِ پیغمبر کو خصوصی طور پر سکونِ قلب عطا کیا، جس کو خدائی سکون (divine calm) کہا جاسکتا ہے۔ اِسی خصوصی تائید کی بنا پر پیغمبر اور اصحابِ پیغمبر اپنے مشن کی تکمیل کر سکے۔

تیسری تائید وہ ہے جو موجودہ زمانے کے اہلِ ایمان کو حاصل ہوئی ہے۔ یہ مذہبی آزادی (religious freedom) کا ناقابلِ تنسیخ حق ہے جو موجودہ زمانے میں عالمی طور پر حاصل ہوا ہے۔ اب دعوت کا کام کسی بھی قسم کی رکاوٹ کے بغیر آزادانہ طور پر انجام دیا جاسکتا ہے۔

مصادرِ شریعت

فقہاء کا یہ ماننا ہے کہ اسلامی شریعت کے مصادر (sources) چار ہیں— قرآن، سنت، اجماع، قیاس، مگر یہ درست نہیں۔ یہ نظریہ تمام تر ذاتی قیاس کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔ قرآن اور سنت کی بنیاد پر اگر مصادرِ شریعت کو متعین کیا جائے تو وہ صرف تین ہوں گے۔ پہلا دو مصدر تو واضح طور پر قرآن اور سنت ہے۔ جہاں تک تیسرے مصدر کا تعلق ہے، اس کے لیے قرآن میں استنباط (4: 83) اور حدیث میں اجتہاد (صحيح البخاري) کا لفظ آیا ہے۔ نص کی بنیاد پر دیکھا جائے تو اصلاً اسلامی شریعت کے یہی تین مصادر ہیں۔ اِن کے سوا کسی چوتھے مصدر کا اضافہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک بدعت ہے، اس کی کوئی منصوص بنیاد نہیں۔

عام طور پر فقہاء نے اجماع (consensus) کو شریعت کا ایک مستقل مصدر قرار دیا ہے، مگر یہ یقینی طور پر ایک بے بنیاد نظریہ ہے۔ شریعت کا مستقل مصدر صرف کوئی نصِ قطعی ہوسکتا ہے۔ نص قطعی کی غیر موجودگی میں کسی چیز کو شریعت کا مستقل مصدر قرار دینا، یقینی طور پر ایک بے بنیاد بات ہے۔ اجماع کی بلاشبہہ ایک اہمیت ہے، لیکن وہ اہمیت صرف یہ ہے کہ کسی خاص موقع پر اجماع کسی پیش آمدہ مسئلے کا ایک عملی حل ہوتا ہے۔ یہ حل یقینی طور پر ایک وقتی حل ہوتا ہے، نہ کہ شریعت کا ابدی مصدر۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں، یہ ایک بے حد اہم بات ہے۔ ضرورت ہے کہ اہلِ علم اِس موضوع پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں اور پورے معاملے پر نظر ثانی کرتے ہوئے دوبارہ اس مسئلے کی ایسی تشریح کریں جو ایک طرف قرآن وسنت کے نصوص کے مطابق ہو۔ اور دوسری طرف اُس میں دورِ جدید کے بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کے لیے قابلِ عمل رہنمائی موجود ہو۔ آج کی ایک ضرورت یہ ہے کہ اسلام کے تعلق (relevance) کو جدید دور کی نسبت سے ثابت کیا جائے، اور یہ کام مذکورہ معاملے کی تشریح کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے بہت سے فکری مسائل کا حل اِس معاملے کی تشریحِ نو سے منسلک ہے۔

قرآن کی سائنسی تفسیر

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ قرآن میں تمام سائنسی مضامین موجود ہیں اور اِن حوالوں کو لے کر قرآن کی سائنسی تفسیر کی جاسکتی ہے۔ اِس معاملے میں کچھ لوگ اِس حد تک گئے ہیں جس کو صرف غیر علمی نقطۂ نظر کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً اُن کا یہ کہنا کہ **ألم نشرح لك صدرك** (94:1) میں علم تشریح الابدان (anatomy) کا حوالہ ہے۔ اور **فكشفنا عنك غطائك فبصرك اليوم حديد** (50:22) میں علم امراضِ چشم کا بیان ہے، وغیرہ۔

قرآن میں سائنسی مضامین کا یہ نظریہ بلاشبہہ ایک بے بنیاد نظریہ ہے۔ قرآن ان معنوں میں ہرگز کوئی سائنسی کتاب نہیں۔ لیکن ایک اور اعتبار سے یہ بات بالکل درست ہے، وہ یہ کہ جدید سائنسی تحقیقات فہمِ قرآن میں مددگار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مثلاً قرآن کی سورہ المومنون میں بتایا گیا ہے کہ: **وجعلنا من الماء كلَّ شئ حيّ** (21:30)۔ یہ بات پچھلے دور کا قاریٔ قرآن بھی ابتدائی طور پر جانتا تھا، مگر موجودہ زمانے کا قاریٔ قرآن جب اِس آیت کو سائنس کی نئی دریافتوں کے ساتھ ملا کر پڑھتا ہے تو وہ اس کی مزید تفصیل جان لیتا ہے۔ اِس بنا پر قرآن کی صداقت کے بارے میں اس کا یقین بڑھ جاتا ہے۔

اِسی طرح قرآن کی سورہ یاسین میں یہ آیت ہے: **وكلٌّ في فلك يسبحون** (36:40)۔ اِس آیت میں اجرامِ سماوی کی گردش کے بارے میں جو بات کہی گئی ہے، اُسے قدیم زمانے کا قاریٔ قرآن بھی سمجھ سکتا تھا، لیکن آج کا ایک قاریٔ قرآن جب جدید سائنسی دریافتوں کو لے کر اِس آیت کو پڑھتا ہے تو وہ مزید اضافے کے ساتھ اِس آیت کو سمجھنے لگتا ہے۔ اِس طرح قرآن کی صداقت کے بارے میں اس کا یقین بڑھ جاتا ہے۔

قرآن کی سائنسی تفسیر کا ایک تصور غلو پر مبنی ہے، قرآن کی سائنسی تفسیر کا دوسرا تصور حقیقت پر مبنی ہے۔ پہلا تصور یقینی طور پر غلط ہے، اور دوسرا تصور یقینی طور پر درست۔

متبادل نظام

قرآن کی سورہ الحج میں ارشاد ہوا ہے: **الـذین إن مکّنّاھم فی الأرض أقاموا الصلوٰۃ، وآتوا الزکاۃَ، وأمروا بالمعروف، ونھوا عن المنکر، ولله عاقبة الأمور** (22:41) یعنی اہلِ ایمان کو اگر ہم زمین میں غلبہ دیں تو وہ نماز قائم کریں گے، اور زکات ادا کریں گے، وہ معروف کا حکم دیں گے، اور منکر سے روکیں گے، اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

قرآن کی اِس آیت میں اہلِ اسلام کی اُس حالت کا بیان ہے جس کو سیاسی اقتدار کہا جاتا ہے۔ لیکن اِس آیت کے مطابق، یہ لوگ سیاسی اقتدار پا کر جو کام انجام دیں گے، وہ عین وہی کام ہے جس کو وہ سیاسی اقتدار سے پہلے بھی انجام دے رہے تھے، یعنی نماز کی اقامت، زکات کو ادا کرنا اور لوگوں کو برائی سے روکنا اور انھیں بھلائی کی تلقین کرنا۔ یہ سب وہی کام ہیں جو ہر مومن اقتدار کے بغیر بھی انجام دیتا ہے اور انھیں کاموں کو اُسے اقتدار پانے کے بعد بھی کرنے کے لیے بتایا گیا ہے۔

اِس سے معلوم ہوا کہ اسلام کے مطابق، سیاسی اقتدار کا وہ مقصد نہیں ہے جس کو کہ کچھ لوگ نہایت جوش کے ساتھ بیان کرتے ہیں، یعنی غریبی ہٹانا، اقتصادی استحصال کو ختم کرنا، سماج کے اندر مادی خوش حالی لانا، آئڈیل نظام قائم کرنا، وغیرہ۔ موجودہ زمانے کے کچھ سیاست پسند مسلمان یہ کہتے ہیں کہ اسلام دنیا کو ایک متبادل نظام (alternative system) دیتا ہے۔ یہ عین وہی چیز ہے جس کو قرآن میں مضاہاۃ (9:30) کہا گیا ہے۔

موجودہ زمانے میں کچھ سیکولر مفکرین نے کہا کہ اشتراکیت (Communism) سرمایہ دارانہ نظام کا بدل (alternative) ہے۔ اِسی طرح کچھ سیکولر مفکرین نے کہا کہ جمہوریت، بادشاہی نظام کا بدل ہے۔ اِسی کی نقل میں کچھ مسلم مفکرین نے یہ کہنا شروع کردیا کہ اسلام سیکولر نظام کا ایک بدل ہے، وہ دنیا کو متبادل سیاسی اور معاشی نظام پیش کرتا ہے۔ مگر اِس تصور کا ماخذ قرآن نہیں ہے، بلکہ اس کا ماخذ صرف اہلِ زمانہ کی تقلید ہے، اِس سے زیادہ اس کی کوئی اور حقیقت نہیں۔

نفاق کی علامت

عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **أربع مَن كن فيه كان منافقا خالصاً۔ ومن كانت فيه خصلة منهن كانت فيه خصلة من النفاق حتى يدَعَها: إذا ئُتمِنَ خانَ، وإذا حدّث كذب، وإذا عاهد غدر، وإذا خاصم فجرَ (صحيح البخاري، كتاب الإيمان، باب علامة المنافق)** یعنی چار خصلتیں ہیں جس کے اندر وہ خصلتیں ہوں، وہ خالص منافق ہے۔ اور جس شخص کے اندر اُن میں سے کوئی ایک خصلت پائی جائے، اُس کے اندر نفاق کی ایک خصلت ہوگی، یہاں تک کہ وہ اس خصلت کو چھوڑ دے—جب اس کو امین بنایا جائے تو وہ خیانت کرے، جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وہ عہد کرے تو وہ اُس عہد سے پھر جائے، اور جب نزاع پیدا ہو تو وہ جھگڑنے لگے۔

اِس حدیث میں منافق کے کردار کو بتایا گیا ہے۔ منافق انسان وہ ہے جو عدم تقویٰ کی بنا پر حق اور ناحق کے معاملے میں غیر حساس (insensitive) ہو جائے۔ ایسا انسان ایک بے اصول انسان بن جاتا ہے۔ اس کے اندر مسئولیت (accountability) کا احساس باقی نہیں رہتا۔ اس کی روش ذاتی مفاد کے تابع ہوتی ہے، نہ کہ اصولِ حق کے تابع۔ اخلاقی معیار کی اہمیت اس کے اندر سے ختم ہو جاتی ہے، وغیرہ۔

اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر اس کو کوئی امانت سونپی جائے تو وہ نہایت آسانی سے اس کے معاملے میں خیانت کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ جب وہ بات کرتا ہے تو اپنے آپ کو سچ بولنے کا پابند نہیں سمجھتا، وہ نہایت آسانی کے ساتھ ایسی بات کہہ دیتا ہے جو حقیقت واقعہ کے خلاف ہو۔ ایسا آدمی عہد کا پابند نہیں ہوتا، وہ نہایت آسانی کے ساتھ عہد کرنے کے باوجود اُس عہد کو توڑ دیتا ہے۔

اِسی طرح ایسے انسان کا یہ حال ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص سے اس کا اختلاف یا نزاع ہو جائے تو وہ اس کے معاملے میں انصاف پر قائم نہیں رہتا۔ وہ علمی گفتگو کے بجائے الزام تراشی کی زبان بولنا

شروع کر دیتا ہے۔ سنجیدہ تبادلۂ خیال کے بجائے، وہ جھگڑے کا انداز اختیار کر لیتا ہے۔ گفتگو کو دلائل تک محدود رکھنے کے بجائے، وہ زیرِ تنقید شخص کی نیت پر حملہ کر دیتا ہے۔ علمی تجزیہ (analysis) کے بجائے، وہ منفی ریمارک (negative remark) دینا شروع کر دیتا ہے۔ حقائق کے حوالے سے بات کرنے کے بجائے، وہ قیاسات کے حوالے سے بات کرنا شروع کر دیتا ہے۔ معاملے کو اصول تک محدود رکھنے کے بجائے، وہ مفروضات کے حوالے سے گفتگو کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اصولی بنیاد پر بحث کرنے کے بجائے، وہ ذاتی نوعیت کی چیزوں سے بحث شروع کر دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ فریقِ ثانی کی طرف ایسی بات منسوب کرنے لگتا ہے جو کہ اُس نے کبھی نہ کہی ہو۔ وہ اپنے موقف کی حمایت میں ایسی باتیں بولنے لگتا ہے جو صرف سنی سنائی ہوتی ہیں، اُن کی کوئی اصل نہیں ہوتی، وغیرہ۔

منافق کی جن خصلتوں کا ذکر مذکورہ حدیثِ رسول میں کیا گیا ہے، وہ بے حد سنگین خصلتیں ہیں۔ اِن کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ جو لوگ اِن خصلتوں کے حامل ہوں، اُن کے اندر کمزور شخصیت (weak personality) پرورش پاتی ہے۔ ایسا آدمی اُس عظیم نعمت اسے محروم ہو جاتا ہے جس کو اسٹرانگ شخصیت (strong personality) کہا جاتا ہے۔

اِس خصلت کا مزید نقصان یہ ہوتا ہے کہ ایسے آدمی کو فرشتوں کی صحبت نہیں ملتی۔ اس کو ربانی الہامات (divine inspirations) نہیں پہنچتے۔ وہ اعلیٰ معرفت کی غذا نہیں پاتا۔ خدا سے اس کا ربط قائم نہیں ہوتا۔ ایسے آدمی کا ذہنی ارتقا (intellectual development) رک جاتا ہے۔ وہ تزکیہ کی نعمت سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایمان کی روشنی اس کے داخل تک نہیں پہنچتی۔

کمزور شخصیت والا آدمی ہمیشہ شیطان کے زیر اثر رہتا ہے۔ اِس کے مقابلے میں، اسٹرانگ شخصیت والے آدمی کے ساتھ وہ ملکوتی تجربہ گزرتا ہے جس کو قرآن میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے: **إن الذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا تتنزل عليهم الملائكة أن لا تخافوا ولا تحزنوا وأبشروا بالجنة التي كنتم توعدون** (41:30)

عروج وزوال کا قانون

قرآن کی سورہ الحدید میں امت کے عروج وزوال کا قانون بتایا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں دو متعلق آیتوں کا ترجمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے: ''کیا ایمان والوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل اللہ کی نصیحت کے آگے اور اُس حق کے آگے جھک جائیں جو نازل ہو چکا ہے۔ اور وہ اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر اُن پر لمبی مدت گزر گئی تو اُن کے دل سخت ہو گئے۔ اور ان میں سے اکثر لوگ نافرمان ہیں۔ جان لو کہ اللہ زمین کو زندگی دیتا ہے اُس کے مردہ ہونے کے بعد۔ ہم نے تمھارے لیے نشانیاں بیان کر دی ہیں، تاکہ تم سمجھو''۔ (57: 16-17)

اِن آیات میں فطرت کا ایک قانون بتایا گیا ہے، مگر عجیب بات ہے کہ قرآن کے مفسرین میں سے غالباً کوئی بھی اس مفہوم کو واضح نہ کر سکا۔ مثال کے طور پر سید قطب (وفات: 1966) نے اِس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے: **ولا بدّ من اليقظة الدائمة كي لا يصيبه التبلّد والقساوة (في ظلال القرآن، جلد 6، صفحہ 3489)** یعنی لازم ہے کہ قلب دائمی طور پر بیدار رہے، تاکہ اس کے اندر سستی اور بے حسی نہ پیدا ہو۔ یہ تفسیر بلاشبہہ خلافِ فطرت ہے۔ اِس تفسیر کا مطلب یہ ہے کہ امت پر دورِ زوال نہ آنے پائے، حالاں کہ دورِ زوال کا آنا ایک فطری تقاضا ہے، کوئی بھی امت اس سے مستثنیٰ نہیں، نہ یہود اور نہ مسلمان۔ اِن آیتوں میں دراصل فطرت کے اُس قانون کو بتایا گیا ہے جس کو ڈی جنریشن (degeneration) کہا جاتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ امتِ مسلمہ کی بعد کی نسلوں میں قساوت کی وہی کمزوری پوری طرح آجائے گی جو اِس سے پہلے یہود کے اندر آچکی ہے۔ اِس کے بعد تمثیل کی زبان میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب ایسا ہو تو علماء امت کو کیا کرنا چاہیے۔ ان کو وہی کرنا چاہیے جو کسان اپنی بنجر زمین پر کرتا ہے۔ وہ پہلے زمین کو تیار کرتا ہے، اس کے بعد وہ اس میں بیج ڈالتا ہے۔ اِسی طرح علماء اور مصلحین کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ پہلے امت کے اندر شعوری بیداری لائیں اور اس کے بعد عملی پروگرام کا نفاذ کریں۔ زوال کے بعد یہی صحیح نقطۂ آغاز (starting point) ہے۔

شعوری بیداری کے بغیر عملی پروگرام کا نفاذ کبھی نتیجہ خیز (result-oriented) نہیں ہوسکتا۔ شعوری بیداری کیا ہے۔ شعوری بیداری کا مطلب ہے — امت کے افراد کے لیے اسلام کو اُن کی ری ڈسکوری (re-discovery) بنانا، ان کے اندر فکری انقلاب لانا، ان کے سامنے اسلام کی تعلیمات کو اِس طرح پیش کرنا جو اُن کے مائنڈ کو ایڈریس کرنے والا ہو، جو اُن کی بے حسی (قساوت) کو دوبارہ حساسیت میں تبدیل کردے۔

مثال کے طور پر مسلمانوں کی موجودہ نسلوں میں عام طور پر زوال کی وہی حالت طاری ہوچکی ہے جس کا ذکر قرآن کی مذکورہ آیت میں کیا گیا ہے۔ اِس کا سبب کیا ہے۔ اِس کا سبب بنیادی طور پر یہ ہے کہ موجودہ زمانہ عقل (reason) کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانے کا انسان کسی بات کو صرف اُس وقت سمجھ پاتا ہے جب کہ وہ اس کو ریزن آؤٹ (reason out) کرسکے۔ اِس کے بغیر وہ اُس بات کا عصری ریلیونس (contemporary relevance) دریافت نہیں کر پاتا، اِس لیے وہ زندہ شعور کے ساتھ اُس کو اخذ (grasp) بھی نہیں کر پاتا۔

اب صورت حال یہ ہے کہ قدیم زمانے میں جو کتابیں لکھی گئیں، وہ سب روایتی اسلوب میں تھیں، جب کہ موجودہ ذہن سائنٹفک ذہن ہے۔ اِس بنا پر قدیم روایتی لٹریچر جدید ذہن کو اپیل نہیں کرتا۔ ایسا لٹریچر جدید ذہن کو ایک غیر متعلق لٹریچر نظر آتا ہے۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے فکری زوال کا اصل سبب یہی ہے۔ موجودہ زمانے میں مسلم دنیا میں سیکڑوں بڑی بڑی تحریکیں اٹھیں، لیکن وہ زوال یافتہ امت کو دوبارہ زندہ امت نہ بنا سکیں۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ اِن تحریکوں نے مسلمانوں کو روایتی اسلوب میں خطاب کیا، وہ عصری اسلوب میں اُن کو خطاب نہ کرسکیں۔ انھوں نے ذہنی انقلاب کے بغیر امت کے سامنے عملی پروگرام پیش کردیا۔ اِس قسم کا طریقِ کار یقینی طور پر بے نتیجہ ہونے والا تھا، کیوں کہ یہ گھوڑے کے آگے گاڑی رکھنا (putting the cart before the horse) کا معاملہ تھا۔ فطری قانون کے مطابق، اِس طریقِ کار کے لیے یہی مقدر تھا کہ وہ عملاً بے نتیجہ ہوکر رہ جائے۔

تاریخ کے فیصلے کو بدلنا

کعبہ کو تقریباً چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم نے مکہ میں بنایا تھا۔ اُس وقت کعبہ مستطیل (rectangle) صورت میں تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے قریش مکہ نے کعبہ کی نئی تعمیر کی۔ اُس وقت انھوں نے کعبہ کی لمبائی کو کم کر کے اس کو مربّع (square) صورت میں تعمیر کیا۔ کعبہ اِس مربع صورت میں آج تک موجود ہے۔

روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اہلیہ عائشہ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ کعبہ کی عمارت کو دوبارہ میں ابراہیمی بنیاد پر بناؤں، مگر آپ اِس سے باز رہے، کیوں کہ عملی اسباب کے تحت اب ایسا ہونا ممکن نہ تھا (صحیح البخاری، کتاب الحج، باب فضل مکة وبنیانها)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس واقعے سے ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ تاریخ کے پہیے کو دوبارہ الٹی طرف نہیں چلایا جاسکتا:

The wheel of history cannot be put in the reverse gear.

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اِس پیغمبرانہ واقعے سے فطرت کا ایک قانون معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ تاریخ کا سفر ہمیشہ ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کی طرف ہوتا ہے۔

تاریخ میں یوٹرن (U turn) لینا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ انسان کی طاقت سے باہر ہے کہ وہ تاریخ کے سفر کو مستقبل سے حال کی طرف اور حال سے ماضی کی طرف جاری کردے۔ تاریخ کے معاملے میں موجود صورت حال (statusquo) کو مان کر منصوبہ بنایا جاتا ہے، نہ کہ اس کا انکار کر کے۔

کعبہ کی تاریخ اِس معاملے کی ایک مثال ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فطرت کے اِس قانون کو تسلیم کرتے ہوئے سابق ابراہیمی بنیاد پر کعبہ کو دوبارہ تعمیر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بعد کو عبداللہ بن زبیر (وفات: 692ء) کا زمانہ آیا تو انھوں نے کعبہ کی عمارت کو توڑ کر اس کو دوبارہ ابراہیمی بنیاد پر بنایا، لیکن عبداللہ بن زبیر کی وفات کے فوراً بعد حجاج بن یوسف الثقفی (وفات: 714ء) نے اس کو

توڑ دیا اور دوبارہ کعبہ کو اس کی سابق بنیاد پر تعمیر کر دیا۔ موجودہ زمانے کے مسلمان اِس اصول سے مکمل طور پر بے خبر ہیں۔ اِس لیے وہ بار بار اِس اصول کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ صرف اپنی تباہی میں مزید اضافہ کر لیتے ہیں۔

بیسویں صدی کے ربع اول میں خلافت تحریک، بیسویں صدی کے نصف ثانی میں فلسطینی تحریک، بیسویں صدی کے نصف آخر میں کشمیری تحریک اور اِس قسم کی دوسری تحریکیں اِسی کا ثبوت ہیں۔ اِن تحریکوں کے لیڈروں نے تاریخ کے فیصلے کو بدلنے کی کوشش کی، مگر تاریخ کا فیصلہ نہیں بدلا، البتہ نادانی کی اِس سیاست نے مسلمانوں کی تباہی میں مزید اضافہ کر دیا۔

وہ لمحہ جب کہ تاریخ کا فیصلہ ہو رہا ہو، اُس وقت آپ اپنی دانش مندانہ پالیسی کے ذریعے فیصلے پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، لیکن جب فیصلہ ہو گیا تو اُس کے بعد فیصلے کو بدلنے کی کوشش کرنا عملاً خودکشی کے سوا اور کچھ نہیں۔

جن اداروں یا افراد کے نام ماہ نامہ الرسالہ اعزازی طور پر جاری کیا گیا ہے، وہ صرف ایک سال کے لئے ہے۔ جو حضرات مسلسل طور پر الرسالہ کو پڑھنا چاہتے ہیں، وہ دفتر کو زرِ تعاون کے ساتھ اپنا خریداری نمبر (US No.) یا اپنا مکمل پتہ بھیج کر دوبارہ اپنے پتے پر الرسالہ جاری فرما سکتے ہیں۔

جو حضرات ''القرآن مشن'' میں شامل ہو کر ہمارا تعاون کرنا چاہتے ہیں، اُن سے گزارش ہے کہ وہ القرآن مشن کے دفتر سے رابطہ کر کے اپنا مکمل پتہ، ٹیلی فون نمبر اور ای میل روانہ کریں، نیز اِس بات کو واضح کریں کہ آپ القرآن مشن میں شامل ہو کر کس طرح اس کے ساتھ اپنا تعاون فرمائیں گے:

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Email: info@alquranmission.org,
Mobile: +91-9810558483, Fax: +91-11-45651771

تمثیلی اسلوب

مولانا جلال الدین رومی (وفات: 1273ء) نے اپنی مشہور ''مثنوی'' جس زمانے میں لکھی، وہ تمثیلی اسلوب کا زمانہ تھا۔ قدیم زمانے میں عام طور پر یہی اسلوب رائج تھا، یعنی اپنی بات کو فرضی مثالوں اور فرضی کہانیوں کی زبان میں بیان کرنا۔ اِسی زمانی اثر کے تحت، مولانا رومی نے اپنی مثنوی تمثیلی اسلوب کے تحت لکھی۔ تمثیلی ادب کا یہ اسلوب نیوٹن (وفات: 1727ء) کے ظہور کے بعد ختم ہوگیا۔ موجودہ زمانے میں تمثیل کا اسلوب ایک غیر علمی اسلوب سمجھا جاتا ہے، علمی اعتبار سے وہ کوئی معتبر اسلوب نہیں۔

مسلمانوں کے ساتھ یہ حادثہ ہوا کہ وہ عہد کی اِس تبدیلی سے بے بہرہ رہے اور اِس بنا پر قدیم زمانے میں مثنوی مولانا روم جس طرح اُن کے یہاں عمومی طور پر رائج تھی، اُسی طرح بعد کے زمانے میں بھی وہ ان کے درمیان رائج رہی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں جدید علمی اسلوب فروغ نہ پا سکا۔ چناں چہ آج بھی اُن کی تقریر وتحریر میں مثنوی مولانا روم کے اشعار اِس طرح نقل کئے جاتے ہیں جیسے کہ وہ ایک مستند علمی بیان کی حیثیت رکھتے ہوں۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اسلوبِ کلام کا براہِ راست تعلق متکلم کے طرزِ فکر سے ہے۔ متکلم اگر فرضی کہانیوں اور غیر واقعی مثالوں کے ذریعے اپنی بات کہنے کا عادی ہو تو اس کی سوچ بھی اِسی قسم کی غیر واقعی سوچ بن جائے گی۔ وہ مفروضات اور یقینیات میں فرق نہ کر سکے گا۔ وہ خیالی تمثیلات کی بنیاد پر ایک بات کہے گا اور یہ سمجھے گا کہ اُس نے جو بات کہی ہے، وہ حقائق کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس کے اندر مبنی بر حقیقت تفکیر (realistic approach) کا ارتقا نہ ہو سکے گا۔ وہ شاعرانہ تخئیل اور مبنی بر حقیقت تفکیر کے فرق کو سمجھنے سے قاصر رہے گا۔

اِس طرزِ فکر کا مزید نقصان یہ ہوگا کہ ایسا آدمی زندگی کے معاملات میں حقیقت پسندانہ رائے قائم نہ کر سکے گا۔ اس کی منصوبہ بندی جذبات پر مبنی ہوگی، نہ کہ عقل وخرد کی بنیاد پر۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسے لوگوں کا کیس فکر اور عمل دونوں اعتبار سے صرف تباہی کا کیس بن کر رہ جائے گا۔

تنقید کی دو قسمیں

تنقید (criticism) کا ایک طریقہ یہ ہے کہ زیر تنقید شخص نے جو بات کہی ہے، اس کو اچھی طرح سمجھا جائے اور پھر اس کے اصل نقطۂ نظر کو لے کر اس پر تنقید کی جائے۔ یہ تنقید کا صحیح اور علمی طریقہ ہے۔ تنقید کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ زیر تنقید شخص نے جو بات کہی ہے، اُس سے خود ساختہ طور پر ایک مفہوم نکالا جائے اور اِسی خود ساختہ مفہوم کو زیر تنقید شخص کی طرف منسوب کر کے اُس پر تنقید کی جائے۔ یہ دوسرا طریقہ تنقید کا غلط اور غیر علمی طریقہ ہے۔

موجودہ زمانے میں، تنقید کا یہ دوسرا طریقہ بہت زیادہ عام ہوگیا ہے۔ موجودہ زمانے میں لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ تنقید کو حقوقِ انسانی کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ تنقید کرنا، اُن کا ذاتی حق ہے۔ یہ ایک مغالطہ آمیز بات ہے۔ تنقید بلاشبہہ ہر انسان کا حق ہے، لیکن یہ کسی بھی شخص کا حق نہیں کہ وہ زیر تنقید شخص کے کلام سے ایک خود ساختہ مفہوم نکالے اور اِس خود ساختہ مفہوم کو زیر تنقید شخص کی طرف منسوب کر کے وہ اس پر پُرشور تنقید شروع کر دے۔

تنقید دراصل علمی تجزیہ (scientific analysis) کا دوسرا نام ہے۔ تنقید حقیقتاً وہی ہے جو علمی تجزیہ کے اسلوب میں کی جائے۔ جو تنقید علمی تجزیہ سے خالی ہو، وہ بلاشبہہ عیب جوئی اور الزام تراشی کے ہم معنیٰ ہے۔ اِس قسم کی تنقید علمی اعتبار سے بے بنیاد ہے، اور شرعی اعتبار سے بلاشبہہ ایسی تنقید ایک سنگین گناہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

علمی تجزیہ طرفین کے لیے مفید ہے، ناقد کے لیے بھی اور زیر تنقید شخص کے لیے بھی۔ علمی تنقید کے ذریعے ناقد کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ زیرِ بحث موضوع کا ازسرِ نو مطالعہ کرے۔ اِسی طرح زیر تنقید شخص کو اُس سے یہ موقع ملتا ہے کہ وہ اپنی رائے کا ازسرِ نو جائزہ لے۔ اِس کے برعکس، غیر علمی تنقید اِس طرح کے کسی مثبت فائدے سے مکمل طور پر خالی ہوتی ہے — علمی تنقید ذہنی ارتقا کا ذریعہ ہے، جب کہ غیر علمی تنقید صرف آدمی کے ذہنی انحطاط کا ذریعہ۔

دعوت اور حکمت

حیدرآباد کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان ہیں۔ وہ الرسالہ کے دعوتی مشن سے جڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ وہاں الرسالہ مطبوعات کے ذریعے دعوتی کام کررہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک دین دار مسلمان سے اِس سلسلے میں ان کی بات ہوتی تھی۔ مذکورہ مسلمان، الرسالہ مطبوعات کے سخت خلاف تھے۔ انھوں نے اِس مسئلے پر ٹھنڈے ذہن کے ساتھ سوچا۔ اِس کے بعد ایک بات ان کی سمجھ میں آئی۔ وہ مذکورہ دین دار مسلمان سے ملے اور ان سے کہا کہ یہاں کچھ تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ وہ اسلام کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کے لیے آپ کوئی ایسی کتاب بتائیے جو جدید اسلوب میں لکھی گئی ہو اور وہ ان کے ذہن کو مطمئن کرے۔ انھوں نے جواب دیا کہ مجھے ایسی کسی کتاب کا علم نہیں۔ پھر انھوں نے اُن کو الرسالہ مطبوعات میں سے ''اسلام اور عصر حاضر'' مطالعے کے لیے دی۔ اِس کتاب کو پڑھ کر مذکورہ دین دار مسلمان بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ اِس ادارے کی اور کتابیں ہمیں پڑھنے کے لیے دیجئے۔

اِسی طرح کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ الرسالہ مشن کے مذکورہ ممبر ایک مسلم لائبریری میں گئے۔ وہاں انھوں نے لائبریری کے ذمے دار سے کہا کہ آپ دوسرے اداروں کی کتابیں اپنے یہاں رکھتے ہیں، آپ کو چاہیے کہ آپ الرسالہ مطبوعات کو بھی اپنے یہاں رکھیں۔ ناظمِ کتب خانہ نے اِس مشورے کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ پھر انھوں نے پوچھا کہ جدید ذہن کو مطمئن کرنے والی کون سی کتابیں آپ کے کتب خانے میں ہیں۔ ناظم کتب خانہ نے کہا کہ ایسی کوئی کتاب ہمارے کتب خانے میں نہیں ہے۔ اِس کے بعد انھوں نے الرسالہ مطبوعات میں سے بعض کتابیں ان کو پڑھنے کے لیے دیں۔ اس کو پڑھ کر ناظمِ کتب خانہ کی رائے بدل گئی۔ انھوں نے کہا کہ جدید ذہن کے لیے یہ کتابیں بہت مفید ہیں، اور پھر اپنے کتب خانے میں الرسالہ کی تمام مطبوعات کو رکھنے کا فیصلہ کرلیا— اِسی کا نام حکیمانہ اسلوب ہے۔ کامیاب دعوتی عمل کے لیے حکیمانہ اسلوب بے حد ضروری ہے۔

ایک غیر سائنسی بیان

موجودہ زمانہ کے مشہور برٹش سائنس داں اسٹفن ہاکنگ (Stephen Hawking) کا ایک بیان اخبارات میں آیا ہے۔ ایک انٹرویو کے دوران انھوں نے کہا کہ — جنت یا زندگی بعد موت کا کوئی وجود نہیں، یہ سب پریوں کی کہانی ہے:

There is no heaven or afterlife, that is a fairy story.
(*The Times of India,* N. Delhi, May 17, 2011, p. 19)

یہ سائنس داں کی زبان سے ایک غیر سائنسی بیان ہے۔ ایک شخص جو جنت کو نہ مانتا ہو، وہ سائنسی زبان میں صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ معلوم طبیعی قوانین کے مطابق، یہاں جنت کا کوئی وجود نہیں:

According to the known physical
laws, Paradise has no existence.

مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اِس معاملے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ سائنس کے جدید ترین مطالعے کے مطابق، کائنات کے مادّے کا صرف 5 فی صد حصہ ہمارے مشاہدے میں آتا ہے۔ کائنات کا بقیہ 95 فی صد مادّہ سرے سے قابلِ مشاہدہ (observable) ہی نہیں۔ ایسی حالت میں خالص سائنسی بیان یہ ہوگا کہ — قیاساً اِس دنیا میں جنت کا کوئی وجود نہیں:

Probably, Paradise has no physical existence.

سائنس (science) مطالعے کا ایک خصوصی طریقہ ہے۔ سائنس کی رسائی صرف اُن حقائق تک ہوتی ہے جو اس کی دوربین (telescope) یا خوردبین (microscope) کے مشاہدے میں آتے ہوں۔ جب خود سائنسی مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ممکن طور پر کائنات کے قابلِ مشاہدہ مادّے کا زیادہ بڑا حصہ موجودہ سائنسی آلات کے مطابق، قابلِ مشاہدہ نہیں۔ ایسی حالت میں، سائنس کے حوالے سے یہ کہنا بلاشبہہ ایک غیر سائنسی بیان ہے کہ — کائنات میں جنت کا کوئی وجود نہیں۔ قدیم زمانے میں علمی بیان کی کوئی محدّد تعریف موجود نہ تھی، مگر موجودہ زمانے میں علمی بیان صرف اُس کو کہا جاتا ہے جو محدّد زبان (specific language) میں ہو۔ اِس علمی تعریف کا لحاظ یقیناً سائنس داں کو بھی کرنا ہے اور غیر سائنس داں کو بھی۔

اسلامی رومانیت

موجودہ زمانے کے مسلمانوں کے کیس کو اگر ایک لفظ میں بتانا ہو تو وہ غالباً اسلامی رومانیت (Islamic romanticism) ہوگا۔ موجودہ زمانے کے تقریباً تمام مسلمان اِسی اسلامی رومانیت میں جی رہے ہیں— ماضی میں گزری ہوئی مسلم شخصیتوں کی کہانیاں، کشف وکرامات کے قصے، جہاد کے واقعات، مفروضہ معیاری نظام، وغیرہ۔ اِنھیں چیزوں نے موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا ذہن بنایا ہے۔ ان کی ہر مجلس میں اِس طرح کی باتوں کا چرچا ہوتا ہے۔ ہر مسلمان یہ سوچتا ہے کہ قدیم پُرفخر سیاسی دور کس طرح دوبارہ واپس لایا جائے۔

اِس اسلامی رومانیت کی سب سے زیادہ تباہ کن مثال سیاسی رومانیت ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں نے بہت سی سیاسی لڑائیاں چھیڑیں۔ یہ سیاسی لڑائیاں مختلف ملکوں میں وہاں کے اقتدار کے خلاف لڑی گئیں۔ اِن لڑائیوں کے دوران مسلمانوں میں عجیب وغریب قسم کی پراسرار کہانیاں پھیلائی جاتی رہیں۔ ہر لڑائی میں پراسرار طور پر فتح کی داستانیں پھیلائی جاتی رہیں، مگر آخر میں معلوم ہوا کہ ہر لڑائی یک طرفہ طور پر صرف مسلمانوں کی تباہی پر ختم ہونے والی تھی۔

یہ اسلامی رومانیت آج بھی مختلف صورتوں میں جاری ہے، مسلم اکثریت والے ملکوں میں بھی اور اُن ملکوں میں بھی جہاں مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں۔ اِسی رومانیت کو قرآن میں امانی (2: 78) کہا گیا ہے، یعنی خوش فہمیاں (wishful thinking)۔

موجودہ زمانے کے تقریباً تمام مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ کسی نہ کسی قسم کی خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ خوش فہمی کے اِس مزاج کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اُن کے اندر حقیقت پسندانہ سوچ ختم ہوگئی ہے، وہ مفروضات میں جیتے ہیں، وہ تصوراتی دنیا میں اپنی خیالی دنیا تعمیر کرتے رہتے ہیں، وہ توہماتی عقائد کو اپنا سہارا بنائے ہوئے ہیں۔ یہ غیر حقیقت پسندانہ مزاج دنیا کے اعتبار سے بھی ہلاکت خیز ہے اور آخرت کے اعتبار سے بھی ہلاکت خیز۔

اتحادِ ملت

اتحاد یا تضامن (unity) ہماری ایک اہم ضرورت ہے۔ پرنٹنگ پریس کے جدید دور میں غالباً سب سے زیادہ جس موضوع پر لکھا گیا ہے، وہ اتحاد ہے، براہِ راست طور پر یا بالواسطہ طور پر۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد موجود نہیں۔ اِس کا سبب کیا ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے رہنماؤں نے مذہب کے حوالے سے اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی، مگر ساری کوششوں کے باوجود ملت کے اندر اتحاد پیدا نہ ہوسکا۔ حقیقت یہ ہے کہ اتحاد ایک عملی ضرورت ہے، اور پریکٹکل وزڈم (practical wisdom) کے شعور ہی سے اتحاد پیدا کیا جاسکتا ہے۔

مذہب کے معاملے میں یکسانیت کبھی ممکن نہیں۔ مذہب کے پہلو سے ہمیشہ لوگوں میں اختلاف رہا ہے اور ہمیشہ اختلاف رہے گا۔ اِس لیے جب بھی مذہب کے حوالے سے اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اُس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ اختلاف میں مزید اضافہ ہوجائے، جیسا کہ بالفعل پیش آیا ہے۔ اتحاد کی بنیاد صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگوں کے اندر اِس عملی ضرورت کا گہرا شعور پیدا ہوجائے کہ اتحاد کے بغیر قرآن کے الفاظ میں، ان کی ہوا اکھڑ جائے گی (8:46)۔ مشہور مقولے کے مطابق، اتحاد کسی گروہ کو مستحکم کرتا ہے، اور اختلاف اس کے زوال کا باعث ہوتا ہے:

United we stand, divided we fall.

اتحاد کا واحد عملی فارمولا یہ ہے کہ لوگوں کے اندر یہ شعور پیدا کیا جائے کہ اختلاف ایک فطری ظاہرہ ہے، وہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ اِس لیے اختلاف کے باوجود مل کر رہنا سیکھو۔ اتحاد کے معاملے میں یہ چیز نقطۂ اتحاد نہیں بن سکتی کہ سب کی سوچ ایک ہوجائے۔ البتہ ایک اور چیز سب کے لیے نقطۂ اتحاد بن سکتی ہے، اور وہ مشترک مفاد (mutual interest) ہے۔ اتحاد ایک عملی ضرورت ہے اور اس کو عملی ضرورت کے حوالے ہی سے قائم کیا جاسکتا ہے۔ اِسی اصول کا نام ڈی لنکنگ پالیسی (delinking policy) ہے۔ اور اِس معاملے میں ڈی لنکنگ پالیسی ہی واحد قابلِ عمل فارمولے کی حیثیت رکھتی ہے۔

ناممکن کی سیاست

موجودہ زمانے کے مسلم رہنما ہر جگہ سیاست کے ہنگامے جاری کئے ہوئے ہیں۔ جہاں بھی کچھ مسلمان ہیں، وہاں اِس کی مثال دیکھی جاسکتی ہے۔ مگر یہ تمام سیاسی ہنگامے مکمل طور پر بے نتیجہ ثابت ہورہے ہیں۔ اِس کا مشترک سبب یہ ہے کہ یہ تمام مسلم رہنما ناممکن کی سیاست چلا رہے ہیں، یعنی ایک ایسی چیز کے نام پر سیاست جو سرے سے قابلِ حصول ہی نہیں۔ ایسی سیاست کا نتیجہ یہی ہوسکتا ہے کہ وہ عملاً بے نتیجہ ہوکر رہ جائے۔

موجودہ زمانے میں اِس قسم کی سیاست ہر مسلم علاقے میں دیکھی جاسکتی ہے— فلسطین میں یہ نعرہ کہ فلسطین پر یہودی قبضے کو ختم کرو اور وہاں دوبارہ عرب حکومت قائم کرو۔ اِسی طرح کشمیر میں یہ سیاست کہ وہاں سے انڈیا کا غلبہ ختم کیا جائے اور کشمیر کو پاکستان کا حصہ قرار دیا جائے۔ اِسی طرح سنکیانگ (چین) اور فلپائن جیسے مقامات پر یہ مطالبہ کہ یہاں دوبارہ مسلم رول قائم کرو، جیسا کہ وہ پہلے وہاں قائم تھا، وغیرہ۔ اِس قسم کی ہر سیاست ناممکن کی سیاست ہے۔ اِس کا کوئی مثبت نتیجہ ہرگز ملنے والا نہیں۔ اِس قسم کی ناممکن سیاست کا واحد انجام یہ ہے کہ جو کچھ ملا ہوا ہے، وہ بھی چھن جائے اور مزید کچھ حاصل نہ ہو۔ ناممکن کی سیاست عقل کے خلاف بھی ہے اور اسلام کے خلاف بھی۔ سیاست کے معاملے میں عقل اور اسلام دونوں کا تقاضا صرف ایک ہے، وہ یہ کہ اس کو نتیجہ خیز ہونا چاہیے۔ جہاں مثبت نتیجہ ملنے کی امید نہ ہو، وہاں ملے ہوئے پر قناعت کرنا ہے، نہ کہ نہ ملے ہوئے کے لیے لڑائی چھیڑنا۔ ناممکن کی سیاست ہمیشہ صرف لیڈروں کے لیے مفید ہوتی ہے، عوام کے لیے اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

ناممکن کی سیاست لیڈر کے لیے استحصال (exploitation) کی سیاست ہے اور عوام کے لیے صرف نادانی کی سیاست۔ ناممکن کی سیاست کے لیے کم سے کم جو لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے، وہ خودکشی کی سیاست ہے۔ خودکشی سے کم کوئی لفظ اِس تباہ کن سیاست کو بیان کرنے کے لیے کافی نہیں۔ مزید یہ کہ ناممکن کی سیاست صرف ایک فرد کی خودکشی نہیں ہے، بلکہ وہ پوری قوم کی خودکشی ہے۔

عظمتِ خویش کانفرنس

آج کل ''عظمت'' کے نام پر ہر جگہ شان دار کانفرنس ہورہی ہیں— عظمت اسلام کانفرنس، عظمتِ قرآن کانفرنس، عظمتِ رسول کانفرنس، عظمتِ صحابہ کانفرنس، وغیرہ۔ عظمت کے نام پر آج کل اِس قسم کی کانفرنسوں کی بہت زیادہ دھوم ہے۔ اِن مختلف کانفرنسوں کا اگر ایک مشترک نام دینا ہو تو وہ صرف ایک ہوگا، اور وہ ہے عظمتِ خویش کانفرنس۔ اِس قسم کی تمام کانفرنسیں دراصل دین کے نام پر اپنے دنیوی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ یہ عین وہی برائی ہے جس سے یہود کو اِن الفاظ میں منع کیا گیا تھا: **ولا تشتروا بایٰاتی ثمناً قلیلاً** (2:41)۔

دورِ زوال میں یہود کا یہ حال ہوگیا تھا کہ وہ دین کے نام پر دنیا حاصل کرنے لگے۔ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق، آج یہی حال موجودہ مسلمانوں کا ہو چکا ہے۔ موجودہ مسلمانوں کے یہاں دین کے نام پر بڑے بڑے نمائشی کام ہورہے ہیں، مگر حقیقت کے اعتبار سے، اُن کا نشانہ صرف یہ ہوتا ہے کہ دین کے نام پر دنیوی مقصد کو حاصل کیا جائے۔ مثلاً دولت، شہرت، عزت، عہدہ، اقتدار، وغیرہ۔

حدیث میں آیا ہے کہ قدیم اہلِ کتاب 72 فرقوں میں بٹ گئے اور امتِ مسلمہ 73 فرقوں میں بٹ جائے گی (**سنن أبي داؤد، رقم الحديث: 4597**)۔ اِس روایت میں، 72 فرقہ اور 73 فرقہ کا لفظ علامتی ہے۔ اِس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ قدیم اہلِ کتاب میں 72 درجے کا بگاڑ آیا تھا اور امتِ مسلمہ میں 73 درجے کا بگاڑ آئے گا۔ دونوں کے درمیان اِس فرق کا سبب زمانی ہے۔ قدیم اہلِ کتاب کا زمانہ دورِ ترقی کے پہلے کا زمانہ ہے۔ اِس بنا پر اُن کے زمانے میں بگاڑ کے اسباب بہت محدود تھے۔ امتِ مسلمہ کا زمانہ ممتد (extend) ہوکر دورِ ترقی تک پہنچ جائے گا۔ اِس بنا پر اُس کے لیے بگاڑ کے اسباب بھی بہت زیادہ بڑھ جائیں گے۔ مثلاً قدیم اہلِ کتاب اسٹیج کی دھوم سے ناآشنا تھے۔ اب امتِ مسلمہ کے افراد کے لیے ممکن ہوگیا ہے کہ وہ دین کے نام پر اسٹیج کی دھوم مچائیں اور اُس کے بڑے بڑے دنیوی فائدے حاصل کریں۔

نظرِ ثانی کی ضرورت

مسلم دنیا کے ایک مشہور عرب عالم کو ہندستان بلایا گیا۔ یہاں تین دن کے اندر اُن کے مختلف پروگرام ہوئے، دہلی میں بھی اور دہلی سے باہر بھی۔ اِن پروگراموں میں دہلی کے مسلمانوں کے علاوہ، اطراف کے مسلمان بھی بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔

مذکورہ عرب عالم کا خصوصی پروگرام 27 مارچ 2011 کو دہلی کی شاہی جامع مسجد میں ہوا۔ یہاں انھوں نے ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کے مجمع میں عربی زبان میں ایک تقریر کی۔ اُن کی اِس تقریر کی رپورٹ دہلی کے اردو اخبار راشٹریہ سہارا (28 مارچ 2011) میں چھپی ہے۔ اِس تقریر کا عنوان یہ ہے: ''قرآن اور تعلیماتِ رسول میں مسلمانوں کے مسائل کا حل''

یہ عنوان مذکورہ تقریر کا خلاصہ ہے۔ مگر اِس تقریر میں مسلمانوں کے لیے کسی متعین راہِ عمل کی نشان دہی موجود نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان پچھلے دو سو سال سے قرآن اور تعلیماتِ رسول کے نام پر بے شمار سرگرمیاں جاری کئے ہوئے ہیں۔ ہر مسجد، ہر مدرسہ، ہر مسلم ادارہ، ہر مسلم اسٹیج پر اِسی کا چرچا ہے۔ ایسی حالت میں، اصل سوال یہ نہیں ہے کہ قرآن اور تعلیماتِ رسول میں مسلمانوں کے مسائل کا حل موجود ہے، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ قرآن اور تعلیماتِ رسول کے نام پر زبردست سرگرمیوں کے باوجود کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں کے مسائل حل نہیں ہوئے۔

دو سو سال پہلے جس طرح مسلم رہنما ساری دنیا میں سازش اور ظلم کی بات کرتے تھے، آج بھی تمام مسلم رہنما ظلم اور سازش کی شکایت کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں اصل کام ماضی کی مسلم سرگرمیوں کا تنقیدی جائزہ ہے، اور جب اِن سرگرمیوں کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اِن مسلم رہنماؤں نے قرآن اور سنت کے نام پر پُر جوش تقریریں کیں، لیکن وہ صحیح راہِ عمل کی نشان دہی نہ کر سکے۔ یہ صحیح راہِ عمل ہے — مسائل (problems) کا چرچا کرنے کے بجائے مواقع (opportunities) کو دریافت کرنا اور دانش مندی کے ساتھ اِن مواقع کو اپنے حق میں استعمال کرنا۔

خدا کی طرف

Road to God

کہا جاتا ہے کہ حجری دور (stone age) میں ایک بار ایسا ہوا کہ دو آدمی کسی بات پر غصہ ہو گئے۔ وہ ایک دوسری کے طرف پتھر پھینکنے لگے۔ اتفاق سے ایک شخص کا پتھر دوسرے شخص کے پتھر سے ٹکرا گیا۔ اُس وقت دو پتھر کے ٹکرانے سے اسپارکنگ (sparking) ہوئی۔ پتھر سے ایک چنگاری نکلی۔ اِس چنگاری کو دیکھ کر دونوں آدمی اپنا غصہ بھول گئے۔ دونوں آدمی اپنے اپنے پتھر کو لے کر اس کو دیکھنے لگے، تاکہ وہ چنگاری کا راز دریافت کریں۔

کہا جاتا ہے کہ یہی وہ واقعہ ہے جہاں سے سچائی کی تلاش کا آغاز ہوا۔ لوگ اِس سوال پر غور کرنے لگے کہ کیا یہاں انسان اور مادہ (matter) کے سوا کوئی اور طاقت موجود ہے۔ یہ سوال دھیرے دھیرے خدا کے تصور تک پہنچا۔ یہ سیکولر مفکرین کا نظریہ ہے۔ مگر اسلام کا تصور یہ ہے کہ پہلے انسان (آدم) ہی سے خالق کے وجود کا تصور انسان کے علم میں آچکا تھا۔ پتھر کے ٹکرانے کا واقعہ اگر درست ہو تو یہ فطرت کے قانون کو تلاش کرنے کا آغاز تھا، نہ کہ خدا کو تلاش کرنے کا آغاز۔ ہر پیغمبر نے یہی بتایا کہ اِس عالمِ موجودات کا ایک خدا ہے اور انسان کو چاہیے کہ وہ اُسی خدا کو اپنا معبود بنائے اور اُسی کی عبادت کرے۔

قرآن اِس پیغمبرانہ الہام کا ایک محفوظ و مستند مجموعہ ہے۔ قرآن کی سورہ الذاریات میں انسان کے مقصد تخلیق کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **وما خلقت الجن والانس إلا ليعبدون** (51: 56) یعنی میں نے جن کو اور انسان کو صرف اِس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی عبداللہ بن عباس کا قول ہے کہ اِس آیت میں **ليعبدون** سے مراد **ليعرفون** ہے، یعنی اِس آیت میں، اللہ کی عبادت سے مراد اللہ کی معرفت حاصل کرنا ہے۔

خدا کی معرفت کیا ہے۔ خدا اِس کائنات کا خالق ہے۔ اُس کی معرفت یہ ہے کہ تخلیق میں خالق کو دریافت (discover) کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ تخلیق اپنے آپ میں خالق کا مکمل تعارف ہے۔

ہمیشہ انسان تخلیق میں خالق کو دیکھتا رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں نیچر کے بارے میں سائنس کی دریافتوں نے تعارف کے اِس دائرے کو ہزاروں گنا زیادہ حد تک بڑھا دیا ہے۔

یہاں اس سلسلے میں ایک بنیادی پہلو کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اِس بنیادی پہلو کو سامنے رکھنا بہت ضروری ہے، ورنہ اندیشہ ہے کہ خدا کے بارے میں انسان کا مطالعہ اس کو یقین کے بجائے کنفیوژن تک پہنچا دے، وہ خدا کی طرف سفر کرتے ہوئے کسی غیر خدا کی منزل تک پہنچ جائے۔

موجودہ زمانے میں سائنس کے حوالے سے خدا کے وجود (existence of God) کو ثابت کرنے کے لیے بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً:

Nature and Science Speaks about God

The Evidence of God in an Expanding Universe

اللہ یتجلی فی عصر العلم (انگریزی سے ترجمہ)

مگر سائنس کے بارے میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ سائنس کامل علم کا نام نہیں۔ سائنس اپنی دریافتوں کے باوجود جہاں تک پہنچی ہے یا پہنچ سکتی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر صرف جزئی علم دے سکے۔ اِس حقیقت کو جے این سلیون (JN Sullivan) نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:

Science gives us but a partial knowledge of reality.

حقیقت یہ ہے کہ خدا کی دریافت کا سفر بنیادی طور پر دو مرحلوں میں طے ہوتا ہے۔ پہلا مرحلہ وہ ہے جو عقلی غور وفکر اور سائنسی معلومات کے ذریعے طے ہوتا ہے۔ یہ ذریعہ بلاشبہہ نہایت اعلیٰ ذریعہ ہے۔ لیکن وہ اپنے آخری درجے میں بھی ایک مسافرِ حق کو جہاں پہنچاتا ہے، وہ صرف احتمال (probability) ہے، یعنی—امکانی طور پر یہاں ایک خدا کا وجود ہے:

Probably there is a God.

یہاں احتمال (probability) سے مراد سادہ طور پر صرف احتمال نہیں ہے، بلکہ اُس سے مراد اعلیٰ عقلی احتمال ہے۔ اعلیٰ عقلی احتمال کو دوسرے لفظوں میں شِبہِ یقین (semi-conviction) کہا جاسکتا ہے۔ احتمال کا یہ مقام وہ مقام ہے جہاں آدمی شک (doubt) کے لمبے راستے کو طے کرکے

آخر کار پہنچتا ہے۔ یہ احتمال دراصل درمیان کا ایک مقام ہے۔ اس کے پیچھے کی طرف شک ہوتا ہے اور آگے کی طرف یقین۔ مگر یہ احتمال اتنا زیادہ قوی ہوتا ہے کہ اب شک کی طرف دوبارہ واپسی اس کے لیے ممکن نہیں ہوتی۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ وہ آگے یقین (conviction) کی طرف بڑھے۔

ایسا ایک آدمی جب پیچھے کی طرف راستہ بند پاکر آگے کی طرف جانا چاہتا ہے تو آگے کی طرف ایک قدم بڑھاتے ہی اس کو ایک نیا تجربہ ہوتا ہے۔ اچانک اس کو محسوس ہوتا ہے کہ میرے اندر وجدان (intuition) کی سطح پر معرفت کا ایک نیا دروازہ کھل گیا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ جس علم کا ادراک اب تک مجھے خارجی معلومات (external data) کے ذریعے ہو رہا تھا، اُس علمی معرفت تک اب میری براہِ راست رسائی ہوگئی ہے۔ جس علم کو اِس سے پہلے میں اپنی خارجی بصارت (objective observation) کے ذریعے جاننے کی کوشش کر رہا تھا، وہ علم اب میرے لیے داخلی بصیرت (inner perception) کا حصہ بن گیا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ عقلی غور وفکر کی حد خلا (vacuum) پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ اس کے بعد فوراً دریافت کا ایک نیا دروازہ کھل جاتا ہے۔ یہ وجدان کا دروازہ ہے۔

آدمی کے اندر بیک وقت دو صفتیں ہیں — عقل (reason)، اور وجدان (intuition)۔ عقل کسی مجہول چیز کا نام نہیں۔ اِسی طرح وجدان بھی کسی مجہول چیز کا نام نہیں۔ باعتبار واقعہ دونوں ہی مسلّمہ حقائق پر مبنی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ عقل خارجی حقائق کی بنیاد پر کام کرتی ہے، جب کہ وجدان براہِ راست طور پر داخلی حقیقت سے جڑا ہوا ہے۔ عقل جس چیز کو خارجی شواہد کے ذریعے معلوم کرتی ہے، وجدان اُسی چیز کو داخلی فطرت کے ذریعے جان لیتا ہے۔ عقل کا سفر زمان ومکان (time & space) تک محدود ہے، لیکن وجدان کا سفر زمان ومکان سے باہر (beyond time & space) تک وسیع ہے۔

احتمال سے یقین تک پہنچنے کا یہ معاملہ کسی خوش فہمی (wishful thinking) پر مبنی نہیں، وہ تمام تر علم کے اوپر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ایک شخص پوری سنجیدگی کے ساتھ احتمال کے درجے تک پہنچتا ہے تو وہ اُس کے لیے ایک ایسا فطری واقعہ ہوتا ہے جو اُس انسان کے ساتھ لازماً پیش آتا ہے جو حقیقی معنوں میں احتمال کے مقام تک پہنچ گیا ہو۔

یہاں یہ سوال ہے کہ وجدان کے ذریعے حاصل ہونے والے علم کو کیوں کر مستند علم سمجھا جائے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ جس آدمی کے اوپر وجدان کا یہ دروازہ کھل جائے، وہ اپنی داخلی بصیرت کے تحت ایسی باتوں کو جاننے لگتا ہے جس کا علم اُس کو پہلے حاصل نہ تھا۔ بعد کو خارجی حقائق بالواسطہ طور پر یہ ثابت کرتے ہیں کہ اُس کو اپنے وجدان کے ذریعے جو علم حاصل ہوا تھا، وہ ایک حقیقی علم تھا، وہ کوئی فرضی واہمہ نہ تھا۔ راقم الحروف کو ذاتی طور پر بار بار اس کا تجربہ ہوا ہے۔

موجودہ زمانے میں سائنسی طریقہ (sientific method) کو مستند طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ کسی چیز کو دریافت (discover) کرنے کے لیے سائنس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ — پہلے مفروضہ، اس کے بعد مشاہدہ، اور پھر تصدیق:

Hypothesis, Observation, Verification

اِس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے ایک سوچنے والے دماغ میں ایک تصوراتی مفروضہ آتا ہے۔ اس کے بعد وہ متعلق شواہد کی تحقیق کرتا ہے۔ اگر یہ شواہد اس کے مفروضہ کی تصدیق کریں تو اس کے بعد اس کا مفروضہ ایک مسلّمہ حقیقت بن جاتا ہے۔ یہی معاملہ وجدان کے ذریعہ دریافت ہونے والی حقیقت کا ہے۔ یہاں بھی یہی ہوتا ہے کہ پہلے ایک سچے متلاشی (true seeker) کے دماغ میں ایک تصور آتا ہے۔ اِس کے بعد وہ متعلقہ حوالوں (relevant reference) کی روشنی میں اس کی مزید تحقیق کرتا ہے، یہاں تک کہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کا مفروضہ درست تھا۔

راقم الحروف کو اپنی تلاش کے دوران بار بار ایسے تجربات پیش آئے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ صوفیا کے حلقے میں ایک قول کا حدیثِ قدسی کی حیثیت سے بہت چرچا ہے۔ وہ قول یہ ہے: **كنتُ كنزاً مخفيا، فأحببتُ أن أُعرف، فخلقتُ خلقاً، فبي عرفوني** (**كشف الخفاء**، 2/1011) یعنی میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، پھر میں نے چاہا کہ میں جانا جاؤں، پھر میں نے ایک مخلوق (انسان) کو پیدا کیا، پھر انسان نے مجھ کو پہچانا۔

میرا بے آمیز وجدان کہتا تھا کہ یہ قول بالکل درست ہے۔ یہ معرفت کے معاملے کی بالکل صحیح تعبیر ہے۔

لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اِس روایت کی کوئی قابلِ اعتماد سند موجود نہیں۔ اِس لیے علما عام طور پر اِس کو مستند نہیں مانتے۔ تاہم میں اس کی تحقیق کرتا رہا۔ چناں چہ میں اِس دریافت تک پہنچا کہ خود قرآن میں اِس تصور کی اصل موجود ہے۔ قرآن کی سورہ الذاریات میں یہ آیت آئی ہے: **وما خلقتُ الجن والإنس إلا لیعبدون** (51:56)۔ مشہور صحابی رسول عبداللہ بن عباس نے اِس آیت میں ''عبادت'' سے مراد معرفت لیا ہے۔ انھوں نے اِس آیت کی تفسیر اِن الفاظ میں کی ہے: **وماخلقت الجن والإنس إلا لیعرفون**۔

اِس مثال میں، میرے وجدان نے مجھ کو ایک علم تک پہنچایا، وہ یہ کہ اس کی اصل خود قرآن میں موجود ہے۔ اِس کے بعد میں نے مزید غور کیا تو میں اِس دریافت تک پہنچا کہ مذکورہ قول دراصل ایک تفسیری قول ہے جس کو قائل نے آیتِ قرآنی کی رعایت سے، حدیثِ قدسی کی زبان میں بیان کر دیا۔ اِس قول کے الفاظ اگر بدل دئے جائیں اور اس کو ایک تفسیری قول کی شکل دے دی جائے تو وہ اِس طرح ہوگا: **کان اللہ کنزاً مخفیا، فأحبّ أن یُعرف، فخلق الخلق**۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک سچے متلاشی کا وجدان، عقلی بنیاد سے بھی زیادہ مضبوط بنیاد ہے۔ عقلی بنیاد آدمی کو صرف فنی سطح کے ظاہری علم تک پہنچاتی ہے، لیکن ایک سچے متلاشی کا وجدان مزید اضافے کے ساتھ حقیقت شناسی (realization of truth) کی سطح پر قائم ہوتا ہے۔ یہی وہ سطح ہے جب کہ ایک ترقی یافتہ ذہن ادراکِ حقیقت کی ایک ایسی سطح پر کھڑا ہو جاتا ہے جہاں سے وہ حقیقت کو براہِ راست دیکھ سکے، وہ اِس درجے تک پہنچ جائے کہ وہ حقیقت کو کسی دلیل کے بغیر پہچاننے لگے۔

اِس معاملے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وجدان کی سطح پر جو یقین حاصل ہوتا ہے، وہ ہمیشہ بڑھتا رہتا ہے۔ اور یہ ایک واقعہ ہے کہ کوئی غیر حقیقی چیز کبھی اضافہ پذیر نہیں ہوتی۔ واہمہ اور حقیقی وجدان میں یہ فرق ہے کہ واہمہ ہمیشہ بے ثبات ہوتا ہے۔ وہ صرف وقتی طور پر آدمی کو متاثر کرتا ہے اور پھر دھیرے دھیرے وہ ختم ہو جاتا ہے۔ اِس کے برعکس، اگر کسی شخص کی رسائی حقیقی وجدان تک ہو جائے تو اُس پر کبھی زوال نہیں آتا۔ حقیقی وجدان ہمیشہ ترقی کرتا رہتا ہے، اس کے یقین کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا، وہ ہمیشہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔

واہمہ ایک مجہول چیز ہے، اس کی کوئی شعوری بنیاد نہیں۔ اِس کے برعکس، وجدان پوری طرح شعور پر مبنی ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وجدان خود شعور کا ایک اعلیٰ درجہ ہے۔ وہ شعور کی تکمیل ہے۔ آدمی اگر سنجیدگی کے ساتھ سوچے تو اس کا داخلی احساس خود بتادے گا کہ کون سی بات صرف واہمہ ہے اور کون سی بات وجدانی علم سے تعلق رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عقل اور وجدان دونوں تلاش کی منزلیں ہیں۔ آدمی کی عقل اُس کو وجدان تک پہنچاتی ہے اور وجدان اس کو حقیقت کے اعلیٰ مرتبے تک پہنچا دیتا ہے۔ جو آدمی اِس اعلیٰ مرتبے تک پہنچتا ہے، اس کے لیے عقل اور وجدان کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی عقل مکمل طور پر وجدان ہوتی ہے، اور اس کا وجدان مکمل طور پر عقل۔ یہی وہ مقام ہے جس کو معرفتِ حق کا اعلیٰ درجہ کہا جاتا ہے۔

تاہم عقلی دریافت اور وجدانی دریافت میں یہ فرق ہے کہ عقلی دریافت ایک موضوعی دریافت (objective discovery) ہے۔ اِس کے مقابلے میں، وجدانی دریافت کی حیثیت ایک داخلی دریافت (subjective discovery) کی ہے۔ اِس بنا پر دونوں دریافتوں کے درمیان بظاہر یہ فرق باقی رہتا ہے کہ عقلی دریافت ایک قابلِ مظاہرہ (demonstrable) دریافت ہے۔ اِس کے مقابلے میں، وجدانی دریافت خارجی طور پر قابلِ مظاہرہ نہیں۔ مگر یہ فرق کوئی حتمی فرق نہیں۔ جہاں تک صاحبِ وجدان کا معاملہ ہے، اس کے اپنے لیے دونوں قسم کی دریافتیں یکساں طور پر قابلِ یقین ہوتی ہیں، صرف اِس فرق کے ساتھ کہ ایک چیز کو وہ پیشانی کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور دوسری چیز کا مشاہدہ وہ دماغ کی آنکھ سے کرتا ہے۔

تاہم یہ فرق آخری فرق نہیں۔ ایک شخص جس کو حقیقی معنوں میں وجدانی دریافت ہو، وہ اِس کے نتیجے میں عام انسان سے واضح طور پر مختلف (different) بن جاتا ہے۔ اس کی سوچ، اس کا بولنا، اس کا سلوک، اس کے اخلاق، اس کے آداب واطوار، ہر چیز دوسرے انسانوں سے اتنا زیادہ مختلف ہو جاتے ہیں کہ وہ حقیقی معنوں میں ایک مختلف انسان (man with a difference) بن جاتا ہے۔ اس کی شخصیت کا یہ فرق اہلِ نظر کے لیے وہی درجہ رکھتا ہے جس کو عقل اور منطق کی زبان میں دلیل کہا جاتا ہے۔

حسنِ جواب

حضرت نظام الدین اولیاء (وفات: 1325ء) کے ملفوظات میں آیا ہے کہ انھوں نے ایک مجلس میں کہا کہ خیر وشر دونوں کا خالق اللہ ہے۔ جس کو جو کچھ پہنچتا ہے، اسی کی مشیت سے پہنچتا ہے۔ اِس کے بعد انھوں نے مشہور ایرانی صوفی ابوسعید ابوالخیر (وفات: 1049ء) کا یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک دن وہ کہیں جارہے تھے کہ راستہ میں ایک نادان آدمی نے پیچھے سے ان کے سر پر ہاتھ سے ماردیا۔ انھوں نے پیچھے مڑکر دیکھا تو اس نادان آدمی نے کہا، مجھے کیا دیکھتے ہو، کیا تم یہ نہیں کہا کرتے تھے کہ کسی کو جو کچھ پہنچتا ہے، خدا کی طرف سے پہنچتا ہے۔ اس کے جواب میں شیخ ابوسعید نے یہ جملہ کہا:

''فرمود کہ ہم چنیں است و لے آں می بینم کہ کدام بد بخت را نامزد این کار کردہ اند''۔ یعنی یہ بات ایسی ہی ہے، لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ خدا نے کس بدنصیب کو اِس کام کے لیے نامزد کیا ہے۔ (فوائد الفوائد، صفحہ 247)

یہ واقعہ حسن جواب کی ایک مثال ہے۔ اِسی بات کو قرآن کی ایک آیت میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **واصبر علی ما یقولون واھجرھم ھجراً جمیلاً** (73:10) یعنی جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں، اُس پر صبر کرو اور خوب صورتی کے ساتھ ان سے الگ ہوجاؤ:

Bear patiently with what they say, and ignore them politely.

اگر مخاطب سنجیدہ ہے اور وہ بات کو سمجھنا چاہتا ہے تو اس کو دلیل کی زبان میں سمجھائیے، اور اگر آپ محسوس کریں کہ مخاطب سمجھنے کے موڈ میں نہیں ہے تو اس کو حسنِ جواب سے ٹال دیجئے۔ یہی 'ہجرِ جمیل' ہے۔ یہ دعوتی عمل کا اہم اصول ہے۔

داعی کو چاہیے کہ وہ مذکورہ دونوں قسم کے انسانوں میں فرق کرے، ورنہ وہ غیر ضروری طور پر لوگوں سے الجھ جائے گا اور اپنے وقت اور اپنی توانائی کو ضائع کرے گا۔ بعض اوقات حسنِ جواب اُس سے زیادہ اہم ہوتا ہے جتنا کہ باقاعدہ قسم کا علمی جواب۔

ذہنی تناؤ کا مسئلہ

ایک خبر کے مطابق، ذہنی تناؤ (mental tension) کا علاج شاک تھیرپی کے ذریعے معلوم کیا گیا ہے۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ — ہلکی برقی رو خارج کرنے والا ایک آلہ سونے کے دوران استعمال کیا جائے تو اس سے ذہنی تناؤ اور مایوسی کی کیفیت سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ سیل فون (cell phone) کے سائز کا یہ آلہ سوتے وقت ماتھے سے لگا دیا جاتا ہے۔ اس میں پیدا ہونے والی برقی رو اتنی ہلکی ہوتی ہے کہ اِس سے نیند خراب نہیں ہوتی ہے۔ رات بھر خارج ہونے والی برقی رو انسان کے اعصابی نظام کو متاثر کرتی ہے، جس سے منفی کیفیات اور ذہنی تناؤ سے چھٹکارا پانے میں مدد ملتی ہے۔ (پندرہ روزہ ''مستقبل''، نئی دہلی، دسمبر 2010، صفحہ 6)

مگر یہ صحیح نہیں۔ ذہنی تناؤ ایک فکری مسئلہ ہے اور فکری مسئلہ کو صرف فکری تدبیر کے ذریعے حل کیا جاسکتا ہے، کوئی ٹکنکل تدبیر اِس معاملے میں کارآمد نہیں ہوسکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ذہنی تناؤ کوئی واقعی مسئلہ نہیں، وہ صرف غیر حقیقت پسندانہ سوچ کا نتیجہ ہے۔ اپنی سوچ کو درست کر لیجئے، اِس کے بعد آپ کو ذہنی تناؤ کی شکایت نہ ہوگی۔

سوچ کی درستگی کیا ہے۔ وہ ہے اپنی سوچ کو عالمِ خارجی کے مطابق بنانا۔ جس صورتِ حال کو آپ بدل نہیں سکتے، اس کو خوش دلی کے ساتھ قبول کر لینا، اِس حقیقت کو مان لینا کہ آپ دنیا کو بدل نہیں سکتے، اِس لیے آپ کو چاہیے کہ خود اپنے آپ کو بدل لیں۔

حقیقت پسندی یہ ہے کہ آپ اپنی ذات کے معاملے میں معیار پسند (idealist) بنیں، اور خارجی دنیا کے معاملے میں آپ پریکٹکل (practical) بن جائیں۔ یہی دانش مندی (wisdom) کا تقاضا ہے۔ ذہنی تناؤ دراصل یہ ہے کہ آدمی اپنے ذاتی معیار اور خارجی واقعہ کے درمیان مفاہمت (adjustment) دریافت نہ کر سکے — ذہنی تناؤ کا حل صرف فکری تھرپی (intellecutal therapy) کے ذریعے ممکن ہے، نہ کہ ٹکنکل تھرپی (technical therapy) کے ذریعے۔

اپنے آپ کو بچایئے

مدر ٹریسا، مقدونیہ (یورپ) میں 1910 میں پیدا ہوئیں اور 1997 کلکتہ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی سماجی خدمات پر ان کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ ان کو 1979 میں نوبل پرائز دیا گیا۔ لیکن مدر ٹریسا کے بارے میں ان کے سوانح نگار نے لکھا ہے کہ — وہ ذہنی کرب کی حالت میں مریں:

She died in agony.

یہی تقریباً تمام مصلحین (reformers) کا حال ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے اصلاحی کام کا آغاز امیدوں کے ساتھ کیا، لیکن جب ان کا آخر وقت آیا تو ہر ایک صرف ناامیدی کی موت مرا۔

اِس کا سبب کیا ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ ہر مصلح خارجی لوگوں کی اصلاح کو اپنا نشانہ بناتا ہے، اور جب خارجی لوگوں کی اصلاح نہیں ہوتی تو وہ مایوسی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی مطلوب اصلاح کے لیے خود اپنی ذات کو نشانہ بنائے۔ ایسی حالت میں یقینی طور پر ہر شخص کامیاب ہوگا، کوئی بھی شخص مایوسی میں مبتلا نہ ہوگا۔

خارجی اصلاح کو نشانہ بنانا، اپنے آپ میں درست ہے، لیکن آئڈیل معنوں میں خارج کی اصلاح کبھی نہیں ہوتی۔ اِس لیے آدمی کو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے خود اپنی ذات کو نشانہ بنائے۔ دوسرے لوگ کسی انسان کے قبضے میں نہیں ہوتے، لیکن آدمی کی اپنی ذات یقینی طور پر اس کے قبضے میں ہے۔ ہر آدمی کو اپنی ذات پر کامل اختیار حاصل ہے۔ ایسی حالت میں اصلاح کے لیے اپنی ذات کو نشانہ بنانا، قابلِ حصول کو نشانہ بنانا ہے، اور قابلِ حصول نشانے کو اپنا نشانہ بنانے والا کبھی ناکام نہیں ہوتا۔

اگر آپ دوسروں کو نہ بچا سکیں تو اپنے آپ کو بچایئے، اپنے آپ کو منفی نفسیات سے مکمل طور پر محفوظ رکھیے، اپنے اندر مثبت شخصیت کی تشکیل کیجئے۔ اگر آپ اپنی ذات کے اوپر کامیاب ہو گئے تو آپ دوسروں کے اوپر بھی ضرور کامیابی حاصل کر لیں گے۔

اکّالُ الرجال

خواجہ الطاف حسین حالی (وفات: 1914) نے اپنی ایک نظم میں ہندستان کو خطاب کرتے ہوئے لکھا ہے: تو نے اے غارت گرِ اقوام واکّال الامم

اکّال کا لفظ آکل کا مبالغہ ہے۔ اکّال کے معنی ہیں — بہت زیادہ کھانے والا (glutton)۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانے کا مسلم معاشرہ ایک ایسا معاشرہ بن چکا ہے جس کو اکّال الرجال کہنا چاہیے، یعنی شخصیتوں کو کھا جانے والا، اعلیٰ قابلیت کے افراد کو تباہ کر دینے والا۔

پچھلے دو سو سال کا زمانہ ایک بالکل نیا زمانہ تھا۔ اِس زمانے میں مسلم شخصیتوں کے لیے کرنے کا کام یہ تھا کہ وہ جدید دور کو سمجھیں اور جدید تقاضے کے مطابق، لوگوں کے سامنے اسلام کا تعارف پیش کریں۔ مگر پورے دو سو سال میں کوئی بھی مسلمان نظر نہیں آتا جس نے دورِ جدید کی نسبت سے حقیقی معنوں میں کوئی قابلِ ذکر کام کیا ہو۔ یہ بلاشبہہ مسلم تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

موجودہ زمانے میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے اندر نہایت اعلیٰ صلاحیت والے افراد پیدا کئے، عربوں میں بھی اور غیر عربوں میں بھی۔ مگر یہ افراد دورِ جدید کا مطلوب کام نہ کر سکے۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ موجودہ زمانے کا مسلم معاشرہ پوری طرح زوال کا شکار ہو چکا تھا۔ اِس زوال یافتہ معاشرے میں جو افراد پیدا ہوئے، وہ اِس فارسی شعر کا مصداق بن گئے کہ — جو چیز نمک کی کان میں جاتی ہے، وہ خود بھی نمک بن جاتی ہے: ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت، نمک شد

ڈاکٹر اقبال نے شاعری کو چھوڑ کر علم کے میدان میں کام کرنا چاہا تھا، مگر اُن کے احباب نے ان کو شاعری میں مشغول کر دیا۔ یہی دورِ جدید میں تمام باصلاحیت افراد کا حال ہوا ہے۔ کوئی معاشرہ کے اثر سے ادب اور شاعری میں مشغول ہو گیا، کوئی نام نہاد ملی مسائل میں الجھ گیا، کوئی مسلمانوں کی سیاسی رومانیت کا شکار ہو گیا، کوئی مسلمانوں کی فخر پسندانہ نفسیات کو غذا دینے لگا۔ غرض ہر ایک زوال یافتہ مسلم معاشرے کا ایک فرد بن گیا، بجائے اس کے کہ وہ مسلمانوں کو اِس زوال سے نکالنے کی کوئی حقیقی کوشش کرے۔

ایک خط

برادر محترم محمد حسن جوہر صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کے خط کے ساتھ آپ کی کتاب ''خطابِ نو'' (صفحات 264) موصول ہوئی۔ اِس کتاب کو دیکھنے کے بعد میرا جو پہلا تاثر تھا، وہ یہ تھا کہ — یہ کتاب ایک ایسے مصنف کا تعارف پیش کرتی ہے جو قلبی درد اور ذہنی سنجیدگی کی صفات اپنے اندر رکھتا ہے۔ کتاب کا یہ پہلو بلاشبہہ کتاب کے اصل موضوع سے بھی زیادہ اہم ہے۔

آپ نے کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ: ''اگر' اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد' کا مطلب یہ بھی ہے کہ مسلمان بیدار ہوتا ہے کسی بڑی ٹریجڈی کے بعد، تو کیا ایسا اب بھی ہونہیں چکا''۔ آپ کا یہ جملہ دراصل فطرت کے ایک قانون کو بیان کرتا ہے۔ موجودہ دنیا کو پیدا کرنے والے نے اُس کا نظام جس اصول پر قائم کیا ہے، اُس کو مورخ آرنلڈ ٹائن بی (وفات: 1975) نے بجا طور پر چیلنج-رسپانس میکانزم (challenge-response mechanism) کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

آرنلڈ ٹائن بی کے مطابق، اگر قوم باشعور ہو تو وہ پیش آمدہ چیلنج کا مثبت جواب (positive response) دیتی ہے۔ اِس طرح اس کی تخلیقیت (creativity) میں اضافہ ہوتا ہے۔ چیلنج اُس کے لیے ترقی کا زینہ (stepping stone) بن جاتا ہے۔ اِس کے برعکس، جس قوم کے رہنماؤں نے اس کو بے شعور بنا رکھا ہو، وہ پیش آمدہ چیلنج کا صرف منفی جواب (negative response) دے گی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ خدا کی اس دنیا میں صرف ایک احتجاجی گروپ (protestant group) بن کر رہ جائے۔ ایسی قوم خدا کے لیے بھی غیر مطلوب ہے، اور انسانوں کے لیے بھی غیر مطلوب۔

نئی دہلی، 25 مارچ 2011 دعا گو

وحید الدین

سوال وجواب

سوال

ماہ نامہ الرسالہ (جون 2007) میں مسیح کی آمد ثانی سے مراد، مسیح کے رول کی آمد ثانی بتایا گیا ہے۔ براہِ کرم، اِس معاملے کو واضح فرمائیں۔ (حافظ ابوالحکم محمد دانیال، بی ایس سی، پٹنہ)۔

جواب

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کے بیانات دو قسم کے ہیں — ایک، محکمات۔ دوسرے، متشابہات (3:7)۔ محکم آیات سے مراد وہ آیتیں ہیں جن میں مدعا کو غیر مشتبہ زبان (exact language) میں بیان کیا گیا ہو۔ مثلاً رمضان کے مہینے میں روزہ رکھنا (2: 283)۔ متشابہ آیات سے مراد وہ آیتیں ہیں جن میں مدعا کو مشتبہ زبان یا غیر متعین الفاظ (inexact language) میں بیان کیا گیا ہو۔ مثلاً قرآن میں بتایا گیا ہے کہ — نماز قائم کرو (أقیموا الصلاۃ)۔ مگر اس میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ نماز کو 24 گھنٹوں کے درمیان کن مخصوص اوقات میں ادا کرو۔

متشابہ اسلوب سے وہی اسلوبِ بیان مراد ہے جس کو فنِ تعلیم میں ڈسکوری متھڈ (discovery method) کہا جاتا ہے، یعنی مسئلہ کو غیر واضح صورت میں طالبِ علم کے سامنے رکھ دینا اور طالب علم کو یہ موقع دینا ہے کہ وہ اپنی قوتِ فکر کو استعمال کر کے غیر واضح مسئلے کو واضح صورت میں دریافت کرے۔

مسیح کی آمد ثانی کو بیان کرنے کے لیے قرآن اور حدیث میں یہی متشابہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے، قرآن میں اشارات کی زبان میں، اور حدیث میں نسبتاً صراحت کی زبان میں۔ مثال کے طور پر قرآن کی سورہ الانعام میں 18 نبیوں، بشمول حضرت مسیح، کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے: **أولئك الذين هدى الله فبهداهم اقتده** (6: 90) یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی، پس تم بھی ان کے طریقے پر چلو۔

قرآن کی سورہ الصّف میں یہ اشارہ نام کی صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ چناں چہ فرمایا کہ:

''اے ایمان والو، تم اللہ کے مددگار بنو جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا، کون اللہ کے واسطے میرا مددگار ہوتا ہے۔ حواریوں نے کہا ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ پس بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ لوگوں نے انکار کیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی، اُن کے دشمنوں کے مقابلے میں، مدد کی۔ پس وہ غالب ہو گئے''۔ (61: 14)

قرآن کی اِس آیت میں اہلِ اسلام کو خطاب کیا گیا ہے۔ اُن سے کہا گیا ہے کہ تم اللہ کی نصرت کرنے والے بنو جس طرح تم سے پہلے عیسیٰ کے حواری، اللہ کی نصرت کرنے والے بنے تھے۔ آیت میں مزید یہ بتایا گیا ہے کہ نصرتِ الٰہی کا یہی پیٹرن تمھارے لیے فتح و کامیابی کا ذریعہ ہوگا۔ اِس سے مراد تاریخِ انسانی کا بعد کا زمانہ ہے، یعنی بعد کے زمانے میں مسیحی ماڈل فتح و کامیابی کا ذریعہ بن جائے گا۔

مسیحی ماڈل عین وہی ماڈل ہے جس کا نمونہ ہم کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی دور میں ملتا ہے۔ مکی دور میں رسول اور اصحاب رسول نے اپنے خلاف کئے جانے والے تشدد کے جواب میں یک طرفہ صبر کا ثبوت دیا۔ اِس اعتبار سے مسیحی ماڈل اور پیغمبر اسلام کا مکی ماڈل دونوں ہم معنی الفاظ ہیں، مگر چوں کہ یہ اندیشہ تھا کہ بعد کے زمانے کے مسلمان مکی ماڈل کی اہمیت سے غافل ہو جائیں گے، اِس لیے اِس دعوتی ماڈل کو قرآن میں مسیحی ماڈل کے حوالے سے بیان کیا گیا۔ کیوں کہ حضرت مسیح کی زندگی میں صرف مکی ماڈل ہے، اُن کے یہاں مدنی ماڈل سرے سے موجود نہیں۔

مسیحی ماڈل یا مکی ماڈل سے مراد کوئی پراسرار چیز نہیں ہے۔ اُس سے مراد عین وہی چیز ہے جس کو دوسرے الفاظ میں دعوت کا پرامن طریقہ (peaceful method of dawah) کہا جا سکتا ہے۔ مسیح کے حوالے سے اِس ماڈل کو بیان کرنا صرف تقریبِ فہم کے لیے ہے، نہ کہ حصر کے لیے۔

اصل یہ ہے کہ قدیم زمانہ مذہبی جبر کا زمانہ تھا۔ اُس زمانے میں مدعو کی طرف سے شدید ردِ عمل کا اظہار ہوتا تھا، حتی کہ بشرطِ استطاعت، تشدد اور قتال کی نوبت آجاتی تھی۔ ''مدنی دور'' دراصل اِسی دورِ تشدد کی ایک علامت ہے۔ مدنی دور میں رسول اور اصحابِ رسول نے قتال کے جواب میں قتال کے ذریعہ اپنا دفاع کیا۔ مگر یہ قتال بلاشبہہ ایک زمانی ظاہرہ تھا، نہ کہ مستقل معنوں میں پیغمبرانہ طریقِ کار کا ظاہرہ۔

اسلامی تاریخ کے بعد کے زمانے میں یہ ہونے والا تھا کہ عالمی حالات میں تبدیلی کے نتیجے میں قتال کا طریقہ ایک متروک طریقہ بن جائے۔ حالات میں ایسا انقلاب آئے کہ پُرامن طریقِ کار پوری طرح نہ صرف ممکن ہوجائے، بلکہ وہ واحد موثر طریقے کی حیثیت اختیار کرلے۔ صرف پُرامن دعوت کے ذریعے وہ سب کچھ قابلِ حصول بن جائے جو قدیم زمانے میں صرف جنگ وقتال کے ذریعے قابلِ حصول سمجھا جاتا تھا۔

پُرامن طریقِ دعوت کی مثال خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں مکی دور میں پوری طرح موجود ہے۔ مگر حالات کے تقاضے کے تحت ایسا ہوا کہ بعد کے زمانے میں پیغمبر اسلام کو دفاعی طور پر جنگ میں حصہ لینا پڑا۔ اِس طرح پیغمبر اسلام کی زندگی میں دونوں طرح کی مثالیں شامل ہوگئیں۔ اب ضرورت تھی کہ بعد کے زمانے کی نسبت سے، پرامن طریقِ کار کو ممیَّز طور پر (distinctively) بیان کیا جائے۔ دراصل یہی مقصد ہے جس کے لیے مسیح کی آمد ثانی (second coming of Christ) کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ مسیح کی آمد ثانی سے مراد دراصل مسیحی ماڈل کی آمد ثانی ہے۔ یہ بات دراصل دورِ آخر کے تبدیل شدہ حالات کی نسبت سے کہی گئی ہے۔ اِس میں دراصل داعی کو یہ بتایا گیا ہے کہ وہ تاریخ کے بعد کے زمانے میں مسلح طریقِ کار سے کامل پرہیز کرے، دعوت کے لیے وہ صرف پرامن طریقِ کار کو استعمال کرے جو کہ دعوتی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے واحد موثر طریقہ بن جائے گا۔

حدیث میں مستقبل کے جس واقعے کو مسیح کی آمد ثانی کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، اُس واقعے کو بالفاظِ دیگر، مکی ماڈل کی آمد ثانی کہا جاسکتا ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے، پہلے بیان اور دوسرے بیان میں کوئی فرق نہیں۔

اصل یہ ہے کہ قرآن میں جن انبیا کا ذکر ہے، اُن میں سے ہر ایک مختلف حالات میں آیا۔ ہر ایک نے اپنے زمانی حالات کے اعتبار سے، ایک طریقہ اختیار کیا۔ اِسی حقیقت کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **لکلّ جعلنا منکم شرعةً ومنهاجا** (5:48)۔ ان میں سے ہر نبی کا نمونہ ایک معیاری نمونہ ہے۔ حالات جس نمونے کا تقاضا کررہے ہوں، اُس نمونے کو اختیار کرلیا جائے گا۔

ایسا کرنا بالکل درست قرار پائے گا، خواہ وہ نمونہ کسی بھی پیغمبر سے تعلق رکھتا ہو۔

حضرت مسیح نے اپنے حالات کے لحاظ سے خالص پُرامن دعوتی عمل کا طریقہ اختیار کیا۔ اِس اعتبار سے حضرت مسیح پرامن دعوتی عمل کے لیے ایک امتیازی ماڈل بن گئے۔ تاریخی طور پر ان کے ماڈل میں پرامن طریقے کے سوا کوئی اور طریقہ شامل نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے دور کے حالات میں پرامن دعوتی عمل کے لیے مسیحی ماڈل کو بطور حوالہ (reference) استعمال کیا گیا۔

سوال

اسلام میں ترکِ دنیا کا تصور کیا ہے، تزکیہ سے اس کا کیا ربط ہے، نیز دنیا سے تعلق کی نوعیت کیا ہے، براہِ کرم، اِس کو واضح فرمائیں (شارق حسین، دہلی)

جواب

دنیا سے تعلق کی تین صورتیں ہیں — دنیا میں ملوث ہونا، دنیا کو ترک کرنا، دنیا کو اعلیٰ مقصد کے لئے استعمال کرنا۔ پہلی صورت، دنیا میں پوری طرح ملوث ہونا ہے۔ اس کو دنیا پرستی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا کی چیزوں ہی کو اپنا مقصود بنالیں، جو اپنی تمام صلاحیتیں دنیا کو پانے کے لیے وقف کردیں، جو دنیا کی کامیابی کو کامیابی سمجھیں اور دنیا کی ناکامی کو ناکامی۔ قرآن کے مطابق، یہ پورے معنوں میں بھٹکے ہوئے لوگ ہیں (17: 103-104)۔

اس معاملے میں دوسری قسم وہ ہے جس کو ترکِ دنیا کہا جاتا ہے، یعنی دنیا کے لوگوں سے اور دنیا کی چیزوں سے کنارہ کشی کرکے الگ تھلگ زندگی گزارنا۔ یہ لوگ بطور خود اس کو بہتر سمجھتے ہیں، مگر یہ صرف غلو (extremism) ہے اور غلو اسلام میں نہیں ہے (**لاغلوَّ فی الإسلام**)۔

تیسری صورت ہے — دنیا کو اعلیٰ ربانی مقصد کے لیے استعمال کرنا۔ دنیا سے تعلق کی یہی صورت درست ہے اور یہی اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہے۔

ترکِ دنیا، ترکِ دعوت ہے۔ دنیا کیا ہے، دنیا خدا کی تخلیق ہے۔ اور جو چیز خدا کی تخلیق ہو، وہ اصلاً برائی نہیں ہوسکتی۔ حدیث میں آیا ہے: **إن الدنیا خُلقت لکم، وأنکم خُلقتم للآخرة** (تخریج

الإحیاء للعراقی، 3/252)۔اس حدیث سے دنیا کی صحیح نوعیت معلوم ہوتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ تزکیہ کا راستہ دنیا سے ہوکر گزرتا ہے۔دنیا کی چیزوں کا صحیح استعمال ہی تزکیہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

سوال

سوال یہ ہے کہ جب ہم سب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امّت سے ہیں، ہم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھتے ہیں، تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم نے الگ الگ فرقے اور مسلک بنالئے ہیں۔(ایس امین باشا، کرناٹک)

جواب

مسلمانوں میں مسلک کی بنیاد پر جو مختلف گروہ ہیں، حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، سلفی، یہ تمام گروہ بعد کے زمانے میں بنے ہیں۔صحابہ اور تابعین کے زمانے میں یہ گروہ موجود نہ تھے۔جو گروہ بندی دورِ اول میں نہ ہو اور بعد کے زمانے میں وجود میں آئی ہو، وہ اپنے آپ میں قابل رد ہے۔یہ مختلف گروہ فقہی مسلک کی بنیاد پر بنے ہیں، لیکن کوئی بھی گروہ کسی بنیادی اختلاف کے تحت نہیں بنا ہے، بلکہ وہ صرف جزئیات میں اختلاف کے تحت بنا ہے۔یہ جزئی اختلافات بے اصل نہیں ہیں، وہ خود صحابہ کے درمیان موجود تھے۔پھر کیا وجہ ہے کہ صحابہ کے زمانے میں اِن جزئیات کی بنا پر الگ الگ گروہ نہیں بنے، مگر بعد کے زمانے میں انھیں جزئیات کو لے کر الگ الگ گروہ بن گئے۔

اِس فرق کا سبب جزئیات میں غلو (extremism) ہے۔صحابہ اور تابعین کے زمانے میں یہ تصور تھا کہ جزئیات میں توسع ہے، یعنی اُن میں سے جس پر چاہو، عمل کر سکتے ہو، تم ہدایت پر رہو گے (**بأیھم اقتدیتم اھتدیتم**)۔لیکن عباسی دور کے فقہاء نے جزئیات کے معاملے میں غلو کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ ان میں سے ہر ایک درست نہیں ہوسکتا، ایک درست ہوگا تو دوسرا غلط ہوگا۔انھوں نے غیر ضروری بحثوں کے ذریعے تعدّد میں توحّد پیدا کرنے کی کوشش کی، یعنی کئی کو ایک بنانا۔جزئیات میں اِسی غلو یا تشدد کی بنا پر مختلف فقہی گروہ بن گئے۔

قرآن اور حدیث میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ غلو اسلام میں نہیں ہے۔اِس مسئلے کا واحد حل

یہ ہے کہ مسلمان، صحابہ اور تابعین کے دور کی طرف لوٹیں۔ وہ اِس اصول کو مان لیں کہ یہ مختلف فقہی مسالک مبتدعانہ طور پر وجود میں آئے ہیں۔ وہ قابلِ ترک ہیں، نہ کہ قابل پیروی۔

سوال

نصاب زکوٰۃ کے تعلق سے قرآن وحدیث کی روشنی میں علماء کرام وائمہ دین کے فتویٰ سے مندرجہ ذیل سوال کی عامۃ المسلمین کی ہدایت ورہنمائی کے لئے تصریح فرما کر مشکور فرمائیں:

1- نصاب زکوٰۃ کا تعین 7.5 تولہ سونا یا 52.5 تولہ چاندی یا ان کی مالیت کے بقدر کیش سے کیا جاتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ گذشتہ زمانہ میں 7.5 تولہ سونا کی قیمت 52.5 تولہ چاندی کے مساوی رہی ہو، لیکن فی زمانہ اِن دھاتوں کی قیمت میں تقریباً 1.40 کا تناسب ہے، یعنی 7.5 تولہ سونا کی قیمت 1,57,000 = 7.5 x 21,000 روپئے اور 31,500 = 600 x 52.5 روپئے۔

اب تک علماء کرام 52.5 چاندی یا اس کی قیمت کو ہی نصاب زکوٰۃ مقرر کرتے رہے ہیں۔ موجودہ حالات میں:

الف: 7.5 تولہ سونا کی قیمت کو نصاب کیوں نہ مانا جائے۔

ب: 7.5 تولہ سونا اور 52.5 تولہ چاندی کی قیمت کے اوسط (تقریباً 90 ہزار روپئے) کو معیار تسلیم کیوں نہ معیار تسلیم کیا جائے۔

2- شافعی مسلک میں استعمالی زیورات زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں، جب کہ حنفی مسلک میں استعمالی زیورات پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ موجودہ دور میں عام مسلمان کو نہ تو مسالک کا علم ہے اور نہ ہی وہ اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اس لئے شافعی مسلک کو اختیار کرنے میں کیا قباحت ہے۔

3- لڑکی کو بوقت نکاح اس کے والدین اور شوہر کی طرف سے زیورات جہیز یا تحفہ میں دئے جاتے ہیں اور وہ صاحب نصاب ہوجاتی ہے۔ لیکن زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے کسی آمدنی کے ذریعہ کا مالک نہیں بنایا جاتا۔ شوہر بیوی کے سرمایہ کی زکوٰۃ کیوں دے۔ اور اگر شوہر کی آمدنی زکوٰۃ ادا کرنے کی متحمل ہو تو ایسی حالت میں کیا کیا جائے۔

الف: متوسط کلاس میں زیور پشت در پشت چلتا ہے۔ اگر زیور فروخت کرکے زکوٰۃ دی جاتی ہے تو وہ روپیہ ایک سال میں ہی خرچ ہوجائے گا اور فیملی مفلس ہوجائے گی، نیز اپنے بچوں کی شادی کے وقت مقروض۔ اِن حالات میں شرعی احکامات کیا ہیں۔

4- متوسط طبقہ میں مشترکہ خاندانی نظام قائم ہے۔ شادی شدہ جوڑے کے پاس نصاب کے مطابق زیور ہے، لیکن آمدنی بہت قلیل ہے۔ ضروریات زندگی کا بار بھی والدین کے ذمہ ہے۔ اس صورت میں کیا کفالت کرنے والے ان کی زکوٰۃ بھی ادا کریں یا یہ جوڑا زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا جاسکتا ہے۔

5- علی کے پاس نصاب کے مطابق کیش تھا۔ اس نے قسط اسکیم کے تحت مکان/زمین/کار خرید لی اور وہ کئی سال کے لئے زکوٰۃ سے بری ہوگیا۔ دوسری طرف حسین کے پاس بھی روپیہ ہے، لیکن وہ یک مشت قیمت دے کر مکان/زمین/کار خریدنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے وہ ہر سال کچھ رقم پس انداز کرتا ہے۔ کیا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا وہ علی کی طرح زکوٰۃ سے بری۔ (شجاع الدین، علی گڑھ)

جواب

عرض ہے کہ مذکورہ قسم کے مسائل میں محتاط طریقہ یہ ہے کہ آپ کو مروّجہ مسالک میں سے جس مسلک پر اطمینان ہو، آپ اُس پر عمل کریں۔ بالفرض آپ کو کسی مسلک پر اطمینان نہ ہو تو صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ ذاتی طور پر اپنی دریافت کے مطابق عمل کریں۔ اِس معاملے کو بحث کا موضوع بنانا صرف اختلاف میں اضافہ کرے گا، اور اسلام میں ہر وہ اقدام غلط ہے جو اختلاف میں اضافے کا سبب بنے (**الخلاف شر**)۔ وہ اصلاح، اصلاح نہیں جس کا نتیجہ مزید اختلاف کی صورت میں نکلنے والا ہو۔

مولانا وحید الدین خاں کی عصری اسلوب میں فکر انگیز اسلامی کتابیں اور ماہنامہ الرسالہ حسب ذیل پتہ پر دستیاب ہیں:

A. H. M. Danyal
(President, Centre for Peace)
Mahatwana, Phulwarisharif, Patna-601505
Mob. 9308477841, 0612-3255435

1- امام حرم مکی ڈاکٹر عبد الرحمٰن السدیس کی آمد (مارچ 2011) کے موقع پر دہلی (رام لیلا میدان، جامع مسجد) میں مختلف مقامات بڑے اجتماعات ہوئے۔ سی پی ایس کے ممبران نے اِس موقع پر لوگوں کو دعوتی لٹریچر دیا۔ خاص طور پر سی پی ایس کے دو ممبران مسٹر رامش صدیقی (نئی دہلی) اور ڈاکٹر محمد اسلم خان (سہارن پور) نے امام حرم سے ملاقات کی۔ ملاقات کے دوران امام حرم نے بتایا کہ اس وقت صدر اسلامی مرکز کی دو کتابیں اُن کے زیر مطالعہ ہیں: **الإسلام يتحدى** اور **التذكير القويم في تفسير القرآن الحكيم**۔

2- سہارن پور (یوپی) کے جے وی جین (J.V. Jain) کالج کے ہال میں 13-12 مارچ 2011 کو ایک انٹرنیشنل سیمنار ہوا۔ یہ سیمنار اے ایس ای اے این (Association of South East Asian) کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اِس سیمنار میں انڈیا کے صنعتی اور اقتصادی ماہرین کے علاوہ، انڈونیشیا، ملیشیا، برونائی، فلپائن، میانمار، کمبوڈیا، لاؤس، تھائی لینڈ، تائی وان اور کوریا کے نمائندے شریک ہوئے۔ اِس موقع پر سی پی ایس سے وابستہ سہارن پور کے افراد نے حاضرین کو قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر دیا۔ تمام نمائندوں نے اِس کو بے حد خوشی کے ساتھ قبول کیا۔

3- سی پی ایس کے تحت چلائے جانے والے القرآن مشن (Al-Quran Mission) سے وابستہ مسٹر علی (کلکتہ) نے مارچ 2011 کے آخری ہفتے میں افریقہ اور برازیل (ساؤتھ امریکا) کا سفر کیا۔ اِس موقع پر انھوں نے وہاں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو قرآن کا انگریزی ترجمہ دیا۔

4- نئی دہلی کے انڈیا ہیبی ٹیٹ سنٹر میں 25 مارچ 2011 کو حسبِ ذیل موضوع پر ایک پینل ڈسکشن ہوا:

The Story is the Distance Between You and the Truth

یہاں ایک اسٹوری بک کے مجموعہ (Teaching Stories) کا افتتاح کیا گیا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اپنی ٹیم کے ساتھ اس میں شرکت کی اور موضوع پر انگریزی زبان میں آدھ گھنٹہ تقریر کی۔ اِس موقع پر حاضرین کو قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر دیا گیا۔

5- مارچ 2011 کے آخری ہفتے میں کولمبو انٹرنیشنل اسکول (سری لنکا) میں ایک پروگرام ہوا۔ اِس میں سی پی ایس (ممبئی) سے وابستہ مسٹر ہارون شیخ نے لوگوں تک قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دیگر دعوتی لٹریچر پہنچایا۔ یہاں دوسرے ممالک کے نمائندے بھی موجود تھے۔ اِن لوگوں نے خوشی کے ساتھ قرآن کو حاصل کیا۔

6- سہارن پور (یوپی) کے حلقہ سی پی ایس نے 24 اپریل 2011 کو پیس ہال میں ایک دعوتی اجتماع کیا۔ اِس اجتماع میں کچھ خاص لوگوں نے بھی شرکت کی۔ مثلاً پنڈت مان کرشن (دھام پور)، مسٹر جیونت راؤ پاٹل (مہاراشٹرا)، سوامی جے پرکاش (ہری دوار)، وغیرہ۔ یہاں دعوتی موضوع پر خطاب ہوا۔ خطاب کے بعد خصوصی مہمانوں نے اپنے تاثرات بیان کئے۔ اِس موقع پر حاضرین کو قرآن کا ہندی اور انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر دیا گیا۔

7- الحکمہ فاؤنڈیشن (نئی دہلی) کے تحت 27 مارچ 2011 کو غالب اکیڈمی (بستی حضرت نظام الدین) کے آڈی ٹوریم میں سیرت النبی کے موضوع پر ایک کانفرنس ہوئی۔ فاؤنڈیشن کی دعوت پر سی پی ایس کے ممبران نے اس میں شرکت کی۔ اِس موقع پر حاضرین کو قرآن کا اردو اور انگریزی ترجمہ اور دعوتی پمفلٹ دیا گیا۔

8- سہارن پور (یوپی) کے نیشنل میڈیکل کالج کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر 3 اپریل 2011 کو مقامی لوگوں کے علاوہ، یوپی گورنمنٹ کے منسٹر اور ایجوکیشنل ڈپارٹمنٹ کے دیگر نمائندوں کو قرآن کا انگریزی ترجمہ دیا گیا۔ اِسی طرح 10 اپریل 2011 کو مذکورہ کالج میں ڈاکٹر ہینی مین ڈے کے موقع پر بھی آئے ہوئے مہمانوں کو کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اسلم خان کی طرف سے قرآن کا ترجمہ دیا گیا۔

9- سی پی ایس (نئی دہلی) کی طرف سے 5 اپریل 2011 کو نئی دہلی کے لودھی گارڈن میں اسپریچول آؤٹنگ کا ایک پروگرام ہوا۔ اِس میں سی پی ایس دہلی اور دیگر مقامات کے افراد شریک ہوئے۔ صدر اسلامی مرکز نے یہاں فطرت کے ماحول میں ایک تربیتی خطاب کیا۔ گارڈن میں مغرب کی نماز باجماعت کے ساتھ یہ پروگرام ختم ہوا۔

10- سہارن پور (یوپی) کے ''پیس ہال'' میں 14 اپریل 2011 کو ذیابیطس (Diabetes) کے موضوع پر ایک ورک شاپ رکھی گئی۔ اس میں دیگر ڈاکٹروں کے علاوہ، سہارن پور کے مشہور ڈاکٹر سنجے ملگانی نے شرکت کی۔ اِس موقع پر تمام شرکا اور ڈاکٹروں کو قرآن کا انگریزی ترجمہ دیا گیا۔

11- لندن (Earl's Court) میں 13-11 اپریل 2011 کو لندن بک فیر (London Book Fair) ہوا۔ نئی دہلی سے اِس بک فیر میں گڈورڈ بکس نے حصہ لیا۔ یہاں گڈورڈ اور تحریک ترسیل قرآن (نیویارک، امریکا) کی طرف سے بڑے پیمانے پر غیر مسلموں کو صدر اسلامی مرکز کا انگریزی ترجمہ قرآن دیا گیا۔ اِس موقع پر برطانیہ کے حسب ذیل تین اداروں میں پرافٹ آف پیس، تذکیر القرآن (انگریزی) اور قرآن کا انگریزی ترجمہ رکھوایا گیا:

آکسفورڈ سنٹر آف اسلامک اسٹڈیز (Oxford Centre of Islamic Studies)۔

مارک فیلڈ سنٹر، لیسٹر (Markfield Centre, Leicester)۔

ایس او ایس، لندن یونی ورسٹی (School of Oriental and African Studies)

12- دوردرشن (DD-1) کے اسٹوڈیو (نئی دہلی) میں 19 اپریل 20011 کو ایک تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا گیا۔ یہ خصوصی انٹرویو ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔ اس کا موضوع امن اور اسلام (Islam and Peace) تھا۔ اس پروگرام کی اینکر مز گورا دھون لال تھیں۔ اِس انٹرویو میں دیگر سوالات کے علاوہ، سنٹر فار پیس اینڈ اسپریچولٹی (CPS) کے بارے میں بھی سوالات کیے گئے۔ اِس سلسلے میں بتایا گیا کہ:

> Peace and spirituality are two phases of a single coin—peace is external culture of spirituality, and spirituality is internal culture of peace.

13- جیوٹی وی (اسلام آباد، پاکستان) کی طرف سے دبئی (عرب امارات) میں مختلف موضوعات پر صدر اسلامی مرکز کے پروگرام کی ریکارڈنگ کا ایک پروگرام 30-24 اپریل 2011 کے درمیان کیا گیا۔ اِس پروگرام میں پاکستان کے مولانا جاوید احمد غامدی بطور مہمانِ خصوصی شریک تھے۔ اِس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے ٹیم کے 6 افراد کے ساتھ دبئی کا سفر کیا۔ سفر کے دوران دبئی اوقاف کے آڈی ٹوریم میں 29 اپریل 2011 کو صدر اسلامی مرکز کا ایک خطاب ہوا۔ یہ ایک دعوتی خطاب تھا۔ اِس میں دبئی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں نے شرکت کی۔ سفر کے دوران سی پی ایس کی ٹیم کے افراد نے مقامی اور غیر ملکی لوگوں سے انٹریکشن کیا اور ان کو قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر دیا۔

14- نئی دہلی کے ٹی وی چینل ''زی سلام'' کے تحت، صدر اسلامی مرکز کے پروگرام ''اسلامی زندگی'' کی ریکارڈنگ جاری ہے۔ یہ پروگرام روزانہ زی سلام کے چینل پر نشر ہوتے ہیں۔ پروگرام کی تفصیل موضوع کے ساتھ درج ذیل ہے:

سنتِ رسول، ختم نبوت، آزادئ فکر اور اسلام (12 اپریل 2011)

عورت دورِ جدید میں، توکل علی اللہ، اسلام اور مساوات (20 اپریل 2011)

دعوت الی اللہ، طلاق اسلام میں، اسلامی جہاد کیا ہے (3 مئی 2011)

15- سی این این (CNN) کے نمائندہ مسٹر ہرمیت (Harmeet Singh) نے 2 مئی 2011 کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ یہ انٹرویو اسامہ بن لادن کی موت (2 مئی 2011) کے موضوع پر تھا۔ سوالات کے دوران بتایا گیا کہ اسامہ کی موت صرف ایک ختم شدہ طاقت کا اعلان ہے۔

16- دوردرشن (انگریزی) چینل کی ٹیم نے 4 مئی 2011 کو صدر اسلامی مرکز کی ویڈیو ریکارڈنگ کی۔ یہ انٹرویو ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ سوالات کا تعلق اسلام کے مختلف پہلوؤں سے تھا۔ مثلاً شتم رسول کا مسئلہ، ارتداد کی سزا، وغیرہ۔ یہ انٹرویو انگریزی زبان میں ہوا۔

17- پرگیا ٹی وی (نئی دہلی) نے 4 مئی 2011 کو صدر اسلامی مرکز کا ایک تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ ان کا ایک چینل ہے جس کو سکسس اسٹوری (Success Story) کہا جاتا ہے۔ اِس کے تحت وہ مختلف افراد سے ان کی کامیابی کے تجربات نقل کرتے ہیں۔ اِس ریکارڈنگ کا موضوع یہی تھا۔ گڈ ورڈ اور سی پی ایس کے بارے میں انھوں نے اِس پہلو سے بہت سے سوالات کئے جن کا انھیں جواب دیا گیا۔ ٹیم کے لوگوں کو قرآن کا انگریزی ترجمہ دیا گیا۔

18- سی پی ایس (نئی دہلی) کی ٹیم نے 10 مئی 2010 کو دہلی کے لودھی گارڈن میں اسپریچول آؤٹنگ کا ایک پروگرام کیا۔ یہ ٹیم کے افراد کے لیے ایک تربیتی پروگرام تھا۔ یہاں صدر اسلامی مرکز نے ٹیم کی دعوتی ذمے داری کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ تقریر کے بعد مغرب کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی گئی۔

19- نئی دہلی کے ایم سی سی ایس (Media Content & Communications Services)

ٹی وی چینل کے نمائندہ مسٹر روی کانت نے 14 مئی 2011 کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اِس انٹرویو کا موضوع تھا— اسلام اور کلچر۔ سوالات کے دوران موضوع کی وضاحت کی گئی۔

20. Mr. Sajid Anwar, Roorki, Uttra Khand: Recently I was on a business trip to Europe. This journey was utilized for Dawah purpose. I visited 3 countries – Belgium, Iceland and Germany during 28th March to 2nd April, 2011. During the travel, I gave the Quran, The prophet of Peace and other dawah literature to many people, mainly technical experts, there. The people accepted with thanks. Comments of some of the recipients are as below:

- I can not attend the meeting in the evening as today in the morning I have got a copy of the Quran which I have to read. (Prof Valdimer, Iceland)
- I was planning to buy Quran for long. Thanks for presenting. I will definitely read this and other books and send you my comments. (Mr. Thor, Director, Iceland)
- After reading the chapter "Negative Thinking Alien to Islam" of The Prophet of Peace, she commented – Truly nice, excellent!. So clearly explained without any ambiguity. (Ms. Shifa Modak, England)

21- برمنگھم کے ادارہ آئی پی سی آئی (IPCI: Islamic Vision, Birmingham) نے دو بڑے دعوتی پروگرام شروع کئے ہیں— ایک، غیر مسلموں کے درمیان قرآن کے انگریزی ترجمے کا بڑے پیمانے پر ڈسٹری بیوشن۔ اور دوسرے، اسلامی نمائش (IslamicExperience Exhibition)۔ یہ نمائش برمنگھم میں مستقل طور پر جاری رہے گی۔ اس کے ذریعے مقامی لوگوں کو قرآن کا انگریزی ترجمہ دیا جارہا ہے اور ان کو اسلام سے متعارف کرانے کا باقاعدہ سلسلہ قائم ہے۔ اِس نمائش میں برطانیہ کے تمام طبقوں کے لوگ کثرت سے شرکت کررہے ہیں۔

22- ترکی کے ایک پریس کے ذریعے صدر اسلامی مرکز کا انگریزی ترجمہ قرآن وہاں سے شائع ہورہا ہے، تاکہ اُسے ترکی میں آنے والے سیاحوں کو دیا جاسکے۔ یہ ترجمہ ترکی کے مختلف سیاحتی مقامات پر بھی رکھوایا جارہا ہے۔

24۔ صدر اسلامی مرکز کا لٹریچر جدید طبقہ تک پہنچایا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں یہاں دو تاثرات ملاحظہ ہوں:

1- I wanted to thank Maulana Wahiduddin Khan for his tireless effort to address us first as human beings then as religious creatures. (Joseph Salomonsen, lecturer Comparative Religion, Norway)

2- I found a book written by Maulana Wahiduddin Khan in my house. It was in the library, and someone else must have been reading it. Anyway, now I am reading it. It's called - *The Reality of Life*. I've already read bits of it, and really like it. Maulana speaks with so much practical wisdom. (Gaurja Prashar, Jesus and Mary College, Delhi University)

23- الرسالہ مشن سے وابستہ دو کشمیری ساتھیوں کے تاثرات یہاں مختصراً نقل کئے جاتے ہیں:

● غالباً 1985 کی بات ہے۔ مجھے الرسالہ کا پہلا شمارہ اپنے ایک ساتھی نور الاسلام خاں کے ذریعے انجینئرنگ کالج کے ہوسٹل میں ملا۔ میں نے جب الرسالہ کی ورق گردانی شروع کی تو ''درخت'' کے موضوع پر لکھے گئے ایک مضمون نے مجھ کو بے حد متاثر کیا۔ اِس میں ایک اہم سبق یہ تھا کہ ہمیں درخت کی طرح کاربن ڈائی آکسائڈ لے کر دوسروں کو آکسیجن مہیا کرنا چاہئے۔ بعد میں میری زندگی تقریباً اسی اصول پر چلتی رہی اور اِس طرح نہ صرف میری خاندانی زندگی، بلکہ سوشل لائف بھی مستحکم رہی۔ کشمیر میں کشیدہ صورت حال کے دوران الرسالہ نے ہمیں کم از کم ذہنی طور پر زندہ رکھا۔ صاحب الرسالہ نے 1975 میں اپنی کتاب ''الاسلام'' میں لکھا تھا کہ: ''میرے اطمینان کے لئے یہ کافی ہے کہ میں نے سچائی کو کم از کم فکری طور پر دریافت کرلیا۔ اب شاید میں یہ کہتے ہوئے مرسکتا ہوں کہ: ''میرے بعد آنے والے کو پچھلی سیڑھیاں نہیں بنانی پڑیں گی'' یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ صاحب الرسالہ ابھی ہمارے درمیان موجود ہیں اور اب اِس دعوتی مہم کی کامیابی کا انحصار تمام تر ہماری انفرادی کوششوں پر ہے، کیوں کہ صاحب الرسالہ نے اپنا حق ادا کردیا۔ ایسے لٹریچر کی فراہمی جو کسی بھی انسان کو اپنے نیچر کی آواز محسوس ہوتی ہے، ایسے لٹریچر کی فراہمی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام آج کی چیز ہے۔ سائنٹفک اسلوب میں دعوتی لٹریچر کی فراہمی یقیناً ایک ایسا کارنامہ ہے جس کے لئے پوری انسانیت صاحب الرسالہ کی احسان مند ہے۔ (انجینئر الطاف حسین شاہ، کشمیر)

● میں بچپن سے تلاشِ حق میں سرگرداں تھا۔ میرے کالج کے تین سال اِس طرح گزرے کہ بے چینی اور بے قراری کے عالم میں رونا میرا معمول بن چکا تھا۔ ایک دن بک اسٹال پر میری نظر ماہ نامہ الرسالہ پر پڑی۔ الرسالہ کو ہاتھ میں لیا اور اس کے مضامین دیکھے تو اچانک مجھ پر یہ احساس غالب ہوا کہ خدا نے میرے لئے ہدایت اور روشنی کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس کے فوراً بعد میں نے الرسالہ کی ایجنسی لی۔ کیوں کہ میں اِس نتیجہ پر پہنچا کہ الرسالہ سے وابستہ ہونے کا مطلب الرسالہ کی دعوتی مہم میں شریک ہونا ہے۔ الرسالہ سے پہلے، شاعری اور افسانہ کی طرف میرا رجحان تھا۔ اب میں شاعری بھی بھول گیا اور افسانہ بھی۔ الرسالہ سے پہلے میں بحث وتکرار کا عادی تھا۔ الرسالہ نے مجھے الفاظ سے نکال کر معنی کی دنیا میں پہنچا دیا۔ الرسالہ فکر کیا ہے۔ الرسالہ فکر دراصل پیغمبرانہ مشن کی صحیح ترین تعبیر اور تشریح ہے جو عقل وفطرت کے ناقابلِ تردید دلائل اور شواہد پر مشتمل ہے۔ اِس تعبیر اور تشریح کی بنیاد قرآن وحدیث اور سیرتِ رسول ہے۔ فکرِ الرسالہ، قرآن کے مرکزی تصور، توحید، رسالت، آخرت اور دعوت کی تفسیر ہے۔ الرسالہ فکر کے اجزائے ترکیبی ہیں— سچائی کی تلاش، بے آمیز حق کی دریافت، معرفتِ خداوندی، عجز، تزکیۂ نفس اور دعوت الی اللہ۔ ان مرحلوں سے گزرے بغیر کوئی بھی شخص حقیقی معنوں میں خدا والا نہیں بن سکتا۔ سچائی کیا ہے۔ ایک سوال کا نام نہیں ہے، بلکہ ہزاروں سوالوں کے مجموعے کا نام ہے۔ الرسالہ فکر اِن تمام سوالوں کا جواب ہے۔ الرسالہ فکر آدمی کے ذہن سے تمام پردوں کو ہٹا دیتا ہے، یہاں تک کہ آدمی ظاہری دنیا میں، باطنی دنیا کو دیکھنے لگتا ہے۔ فکر الرسالہ ربانی حکمت اور ایمانی

بصیرت کا خزانہ ہے جس میں دنیا کی حقیقی کامیابی اور آخرت کی حقیقی کامیابی کے راز پوشیدہ ہیں۔ الرسالہ فکر آدمی کے جینے کی سطح کو بدل دیتا ہے۔ وہ آدمی کو حقیقی اور لازوال خدا سے ملاتا ہے۔ اس گہرے تعلق باللہ کی علامت کے طور پر آدمی کو عینِ خاشع، یعنی گریہ والی آنکھ حاصل ہوتی ہے۔ اِس کے بارے میں صاحبِ الرسالہ کا ایک قول یہ ہے: ''اللہ کا ڈر آدمی کی آنکھوں کو اشک آلود کر دیتا ہے۔ مگر اللہ کے لئے بھیگی ہوئی آنکھ ہی وہ آنکھ ہے جس کے لئے یہ مقدر ہے کہ اُس کو ٹھنڈک حاصل ہو، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی''۔

مجھے الرسالہ کے آتشیں الفاظ میں صاحبِ الرسالہ کے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی ہیں۔ اتنے اعلیٰ الفاظ میں کلام کرنا ایک سچے داعیِ حق اور عارف باللہ کے سوا کسی اور کے لئے ممکن نہیں۔ کیا آپ الرسالہ کے مضامین میں اُن آتشیں کیفیات کو محسوس کر رہے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ الرسالہ بے پناہ درد وغم میں پگھل رہا ہے۔ کیا آپ الرسالہ کے اوراق میں جا بجا اُن لاتعداد بھونچالوں کی شدت محسوس کر رہے ہیں جو صاحبِ الرسالہ کے سینے میں امنڈ رہے ہیں۔ خدا نے ہمارے لئے مشکل ترین کام کو آسان ترین بنایا ہے۔ خدا نے دورِ جدید میں مولانا وحید الدین خاں صاحب سے تجدید واحیاءِ دین کا کام لیا ہے۔ ان کے ذریعے قرآن وحدیث اور اُس سے متعلق انتہائی طاقتور لٹریچر وجود میں آ گیا ہے، جو دنیا کے ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں پر حجت قائم کرنے کے لئے کافی ہے۔ داعیانِ حق کی جماعت میں شامل ہونے کے لئے ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ ہم اس لٹریچر کو حق سے غافل یا حق سے بے خبر بندگانِ خدا تک پہنچا دیں، تاکہ ہم خدا کی بارگاہ میں بری الذمہ ہوں اور لوگوں کے لئے عذر کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ ہمارے لئے اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم اِس خدائی کام کو اپنا ذاتی مسئلہ بنائیں، بلکہ اِس سے بڑھ کر ہم اس کو اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ بنالیں۔ اگر ہمارا یہ واقعی فیصلہ ہے تو ہمیں اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ آج تک ہم اِس دعوتی مہم میں اپنی آمدنی کا کتنا حصہ خرچ کر چکے ہیں۔ اگر ہمارا جواب نفی میں ہو، تو آج سے ہمیں شعوری طور پر یہ طے کرنا چاہیے کہ ہم اپنی آمدنی اور وسائل کا کتنا حصہ اس خدائی کام کے لئے وقف کرنے کو تیار ہیں۔ خدا کی بارگاہ میں ''کرنے'' کی قیمت ہے، نہ کہ صرف ''کہنے'' کی۔ (نذیر الاسلام، کشمیر)

The Spiritual Message

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن حاصل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل پتے پر رابطہ کریں:

The Spritual Message
302, Koldongri CHS, Sahar Road
Andheri (East), Mumbai-400 099 (India)
Tel.: 022-42214700, Fax: 022-28236323
Email: spiritual.msg@gmail.com

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

1- الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن 25 فی صد ہے۔ 100 پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن 33 فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

2- زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

3- کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

Rahnuma-e-Hayat
by
Maulana Wahiduddin Khan
ETV Urdu
Tuesday and Wednesday 10.30 pm
Saturday and Sunday 6.00 am

Islami Zindagi
by
Maulana Wahiduddin Khan
Zee Salaam
Daily 11.30 am and 6.30 pm

ISLAM FOR KIDS
by
Saniyasnain Khan
ETV Urdu
Sunday 11.30 am
Friday 3.30 pm, Saturday 11.00 am

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر
اتحادِ ملّت
احیاءِ اسلام
اسباقِ تاریخ
اسفارِ ہند
اسلام: ایک تعارف
اسلام: ایک عظیم جدوجہد
اسلام اور عصرِ حاضر
اسلام پندرہویں صدی میں
اسلام دورِ جدید کا خالق
اسلام دینِ فطرت
اسلام کا تعارف
اسلام کیا ہے
اسلامی تعلیمات
اسلامی دعوت
اسلامی زندگی
اقوالِ حکمت
الاسلام
الربانیۃ
امنِ عالم
امہات المومنین
انسان اپنے آپ کو پہچان
انسان کی منزل
ایمانی طاقت
آخری سفر
باغِ جنت
پیغمبرِ اسلام
پیغمبرِ انقلاب
تذکیر القرآن
تاریخ دعوتِ حق
تاریخ کا سبق
تبلیغی تحریک
تجدید دین
تذکیۂ نفس
تصویرِ ملت
تعارفِ اسلام
تعبیر کی غلطی
تعدد ازواج
تعمیرِ انسانیت

تعمیرِ حیات
تعمیر کی طرف
تعمیرِ ملت
حدیثِ رسول
حقیقتِ حج
حقیقت کی تلاش
حل یہاں ہے
حیاتِ طیبہ
خاتونِ اسلام
خدا اور انسان
خلیج ڈائری
دعوتِ اسلام
دعوتِ حق
دینِ انسانیت
دینِ کامل
دین کی سیاسی تعبیر
دین کیا ہے
دینِ وشریعت
دینی تعلیم
ڈائری 84-1983
ڈائری 90-1989
ڈائری 92-1991
ڈائری 94-1993
رازِ حیات
راہِ عمل
راہیں بند نہیں
روشن مستقبل
رہنمائے حیات (کتابچہ)
رہنمائے حیات
زلزلۂ قیامت
سبق آموز واقعات
سچا راستہ
سفرنامہ اسپین و فلسطین
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد اول)
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد دوم)
سوشلزم اور اسلام
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ
سیرتِ رسول
شتمِ رسول کا مسئلہ

صراطِ مستقیم
صوم رمضان
طلاق اسلام میں
ظہورِ اسلام
عظمتِ اسلام
عظمتِ صحابہ
عظمتِ قرآن
عظمتِ مومن
عقلیاتِ اسلام
علما اور دورِ جدید
عورت معمارِ انسانیت
فسادات کا مسئلہ
فکرِ اسلامی
کامیاب ازدواجی زندگی
قال اللہ وقال الرسول
قرآن کا مطلوب انسان
قیادت نامہ
قیامت کا الارم
کاروانِ ملت
کتابِ زندگی
کشمیر میں امن
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے
مذہب اور جدید چیلنج
مذہب اور سائنس
مسائلِ اجتہاد
مضامین اسلام
مطالعۂ حدیث
مطالعۂ سیرت (کتابچہ)
مطالعۂ سیرت
مطالعۂ قرآن
منزل کی طرف
مولانا مودودی شخصیت اور تحریک
میوات کا سفر
نارِ جہنم
نشری تقریریں
ہندستان آزادی کے بعد
ہندستانی مسلمان
ہند-پاک ڈائری
یکساں سول کوڈ